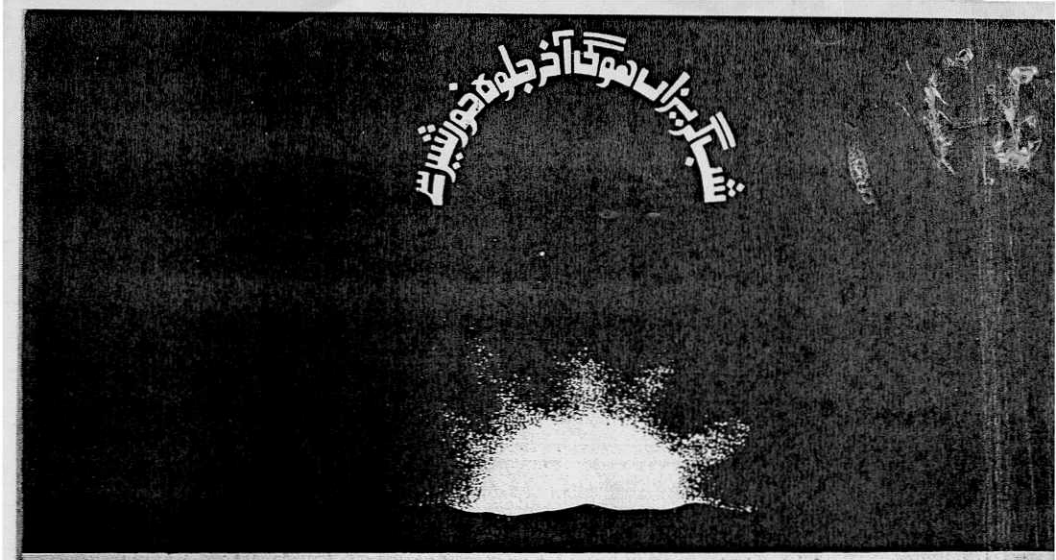

پاکستان کا مستقبل

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ہم نے علم کو علمِ دین تک اور دین کو قرآن اور حدیث کے الفاظ تک محدود کر دیا، حالانکہ اس وقت جس قدر صحیح اور سچا علم دُنیا میں موجود ہے یا آئندہ زمانوں میں انسان کی ذہنی کاوش سے پیدا ہونے والا ہے وہ علمِ دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں علوم کی ترقی قرآن کے علم کو بہت آگے لے گئی ہے، لیکن ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ بلکہ قرآن آگے جا رہا ہے اور ہمارا رُخ پیچھے کی طرف ہے ۔

ڈاکٹر رفیع الدین

"پاکستان کا مستقبل" سے اقتباس

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس
فرینڈز کالونی، ملتان روڈ، لاہور

پاکستان کا مستقبل

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

نقوشِ اشاعتِ اوّل

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
تا بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی
(اقبال)

پاکستان کا مستقبل

جسمیں

بتایا گیا ہے کہ کس طرح اسلام ایک کامل عمرانی نظریہ اور نظامِ تعلیمات ہے۔ جو آخر کار اشتراکیت اور دوسرے نظامہائے تعلیمات کو مٹا کر دنیا میں پھیل جائے گا۔ مسلمانوں کے موجودہ انحطاط کے حقیقی اسباب کیا ہیں اور کیونکر پاکستان اس انحطاط کو عروج میں بدل کر اسلام کی آخری فتح اور دنیا کی مستقل نجات کا موجب ہوگا

مُصنّفہ
ملک محمد رفیع الدین ایم، اے
سابق پرنسپل کے ایس کالج میرپور کشمیر
و ڈپٹی اسسٹنٹ محکمہ تعمیرِ ملت لاہور
حکومت مغربی پنجاب لاہور

فہرست مضامین

۱ - مرض ———————— ۹
۲ - پائیدار زندگی کی صلاحیتیں ———————— ۱۱
۳ - مرض کے اسباب ———————— ۲۴
۴ - مرض کا علاج ———————— ۴۸
۵ - مریض کا تعاون ———————— ۹۲
۶ - صحت ———————— ۱۱۷

قیمت ۲۵ روپے
طابع : نفیس پرنٹرز لاہور
ناشر : آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

جوازِ اشاعتِ مکرّر

ایک ایسی کتاب جو آج سے قریباً چالیس سال پہلے شائع ہوئی، پھر آج تک اس کا دوسرا ایڈیشن چھپنے کی نوبت نہ آئی اس کی اشاعتِ مکرّر کا جواز پیش کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں آج ہر ہوشمند پاکستانی فکرمند ہے۔ خارجی خطرات سے کہیں زیادہ سنگین تر وہ داخلی روگ ہیں جو جسدِ ملّی کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اور ستمگاریٔ حالات کا سب سے زیادہ دردناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے سیاسی اور دینی راہنما اپنے بدشگون بیانات سے مُلک میں مایوسی کی گھٹیتا کو مزید گہرا کر رہے ہیں۔

خدا کی رحمت پر بھروسہ رکھنے والے بندگانِ خدا جنہوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا آج بھی اس انتظار میں ہیں کہ نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز رکھنے والا کوئی مردِ خدا ہم میں سے اُٹھے گا اور قوم کو بتلائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے وہ ابھی پُورا نہیں ہوا، اسے بہرحال پُورا ہو کر رہنا ہے اور یہ سوچنا بھی کُفر ہے کہ خدا کا کوئی کام (نعوذ باللہ) بے مقصد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور جو "کارِ مرداں روشنی و گرمی است" کے قلم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، جب تک زندہ رہے قوم کو روشن مستقبل کی نوید سُناتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں آپ نے "پاکستان کا مستقبل" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی اور اسے شائع کیا۔ اس کتاب میں آپ نے قوم کے بنیادی مرض کی تشخیص کی اور اس کا علاج بھی تجویز کیا۔ لیکن ہماری قوم کی بے خبری کا یہ عالم ہے کہ وہ خسروانہ انداز رکھنے والے اس مردِ درویش کے کام بلکہ نام تک سے ناواقف ہے جو عمر بھر تند و تیز ہواؤں میں اپنا چراغ جلاتا رہا۔ مگر اس میں تعجب کی بات نہیں کیونکہ انسانی تاریخ میں ایسا اکثر ہوتا آیا ہے۔

موجودہ حالات میں جب تاریکیاں کچھ زیادہ ہی پھیلتی جا رہی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مردِ درویش کے چراغ سے روشنی حاصل کی جائے جس کی رجائیت پسندی کا یہ عالم رہا کہ کسی بھی حالت میں مایوسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا بلکہ مرض کو بھی رحمت ہی خیال کیا؛ ذرا سُنیے

"عجیب بات ہے کہ کئی امراض کی صورت میں آج تک مرض کو روکنے کیلئے مرض کو پیدا کرنے سے بہتر کوئی طریقہ علاج ایجاد نہیں ہوا۔ وہ مرض جو اگر گزر جائے جسم کے لیے رحمت بن

جاتا ہے، کیونکہ اس سے جسم کی مخفی قوتیں جو مرض کو روکنے کے لیے فطرت نے اس کے اندر رکھی ہوئی ہیں بروئے کار آجاتی ہیں اور اس کی آئندہ صحت کی ضامن بن جاتی ہیں۔"

ڈاکٹر رفیع الدین مایوسی پھیلانے والے سیاسی اور دینی رہنماؤں سے سخت بیزار تھے۔ پیشہ ور سیاسی علماء کے بارے میں اُن کی عمومی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ دینی بصیرت سے محروم ہیں۔ اُن کے نزدیک دین کا علم ایک روحانی استعداد ہے اور مطالعہ کتب پر موقوف نہیں۔ اُن کے خیال میں علامہ اقبال اس روحانی استعداد سے پوری طرح بہرہ ور تھے اور ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی اُمتی کو دورِ جدید کے غلط تصورات کے خلاف حق و صداقت کے قدرتی ردِ عمل کا آلۂ کار بننے کے لیے درکار ہیں نیز ان کی یہ قطعی رائے تھی کہ علامہ اقبال کا فلسفہ ان کا ذاتی فلسفہ نہیں بلکہ فقط جذبۂ ایمان کی عقلی توجیہہ اور تشریح" ہے۔ چنانچہ وہ فلسفہ خودی کو "علم جدید کی روشنی میں قرآن کی تفسیر اور قرآن کی روشنی میں علم جدید کی تطہیر" قرار دیتے ہیں اور بلا تامل ہمارے مرض کا یہ علاج تجویز کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کو ریاست کا سرکاری نظریہ قرار دے کر فلسفہ خودی کو اسلام کی سرکاری ترجمانی کے لیے کام میں لایا جائے۔ اپنے اس موقف کی تائید میں وہ بہت ہی محکم دلائل رکھتے تھے۔

افسوس کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے امید افزا اور یقین افروز افکار و نظریات سے ہم ابھی تک کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکے جو عمر بھر ہمیں اپنی تحریروں کے ذریعے ماں کی ممتا کی سی دلسوزی کے ساتھ پکارتے رہے۔

دستِ ہر نااہل بیمارت کند سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

موجودہ وقت کا شدید تقاضا ہے کہ ہم ان کی باتوں پر توجہ دیں جو انہوں نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں لکھی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کا فکر بلند ظلمتِ شب میں صفتِ برق چمک رہا ہے جو ہمارے اُلجھے ہوئے قومی معاملات اور حالات میں رہنمائی کے لیے مفید بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔ یہی چیز ہمارے لیے اس کی اشاعتِ مکرر کا جواز بنی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کا مطالعہ آج ہر محبِ وطن پاکستانی پر واجب ہے جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہے۔

مظفر حسین

۱۰ مئی ۱۹۹۴ء اکیڈیمک اینڈ منسٹریٹو ڈائریکٹر آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس

پاکستان کا مستقبل

میں نے اپنی کتاب آئیڈیالوجی آف دی فیوچر Ideology of the Future. میں اقبال کے تصورِ خودی کی منظم تشریح کرتے ہوئے اُس کو اُس کے آخری نتائج تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا تو رجحانات ارتقاء کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوا کہ حقائق فطرت ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ زود یا بدیر عالم انسانی میں ایک ایسی ریاست وجود میں آئے گی جو نہایت اخلاص کے ساتھ اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنا سیاسی نظریہ بنائے گی اور پھر یہ ریاست رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور اس کے ذریعے سے آدم اپنے انتہائی عروج کو پہنچے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے اس خیال کو ان حقائق کے سمیت جو اس پر مجبور کرتے ہیں، اس کتاب کی فصل پالیٹکس اینڈ وار ——— Politics and War. میں درج کیا ہے۔ یہ کتاب مئی ۱۹۴۴ء میں ختم ہوئی تھی۔ اُس وقت پاکستان کا مطالبہ اکثر مسلمانوں کے نزدیک ایک دھندلی سی اُمید اور اکثر ہندوؤں اور انگریزوں کے نزدیک سودے بازی کے لیے ایک چال سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اگرچہ میں نے لکھا کہ مستقبل کی عالمگیر اسلامی ریاست نومسلموں کے ایک گروہ کی لمبی اور دشوار جدوجہد کے بعد عدم سے وجود میں آئے گی اور ایک فلسفیانہ ریاست ہوگی جو اسلام کے فلسفہ

یعنی فلسفۂ خودی پر جو ایک ہی صحیح اور سچا فلسفہ ہے قائم ہوگی اور فلسفۂ خودی کی اشاعت اس کی توسیع کا بڑا ذریعہ بنے گی وغیرہ۔ تاہم اس وقت اس ریاست کی باریک جزئیات پر مثلاً یہ کہ وہ کہاں وجود میں آئے گی غور کرنے کی ضرورت موجود نہ تھی اور اگر میں غور کرتا بھی تو شاید اس وقت نتائج اخذ کرنے کے لیے کافی وجوہات نہ پا سکتا۔ لہٰذا میں نے ان جزئیات کو مستقبل کے سپرد کر رکھا کہ وہ ان کو جس طرح سے کہ وہ فی الواقع ظہور پذیر ہونے والی ہیں اپنے وقت پر خود بخود بے نقاب کرے گا۔

اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس ریاست کو دیکھنا میری قسمت میں ہوگا۔ لیکن میں خیال کرتا تھا کہ روحِ اسلام کے مطابق اس کے دستور اساسی کی تشکیل میں اس کے نظم و نسق میں، اس کی اندرونی اور بیرونی پالیسی کو وضع کرنے میں، اس کے صنعتی، تبلیغی، تجارتی، تعلیمی اور مالی نظام کی تشکیل میں مستقبل کے مسلمانوں کو دقت پیش آئے گی، اور میری تمنا تھی کہ میں اس ریاست کا خاکہ بناؤں اور ان امور کے متعلق جیسا کہ میں ان کو سمجھتا ہوں اپنی تجاویز پر مدلل طور پر لکھ دوں تاکہ جب یہ ریاست وجود میں آئے تو مسلمان میری تجاویز کو بھی غور و فکر کے بعد جس حد تک کارآمد پائیں کام میں لائیں۔ لیکن ریاستی ملازمت کی مجبوریوں اور بعض اور مجبوریوں کی وجہ سے جن میں سے ایک یہ تھی کہ میری پہلی کتاب چھپنے میں دیر ہو گئی، اس کام کو جلدی ہاتھ میں لینا ممکن نہ ہوا۔

لیکن جب پاکستان کے مطالبہ نے زور پکڑا تو میری توجہ بعض ایسے حقائق کی طرف ہوئی جن کی بنا پر مجھے یقین ہو گیا کہ مستقبل کی عظیم الشان اور عالمگیر اسلامی ریاست جس کی طرف حقائقِ فطرت اشارہ کر رہے ہیں پاکستان ہی ہے اور پاکستان بن کر رہے گا۔ جب پاکستان بن گیا تو میں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں اپنی کتاب کا ایک نسخہ بھیجا اور ایک طویل عریضہ لکھا کہ کس طرح سے اگر پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنایا گیا تو اس کا مستقبل ہماری توقعات سے بڑھ کر شاندار ہوگا اور کس طرح فلسفۂ خودی اس زمانہ کی اسلامی ریاست کی مشکلات کا قدرتی

حل ہے اس عریضہ کی کاپیاں بعض وزراء کو اور اسمبلی کے اراکین کو بھیجیں، لیکن اس وقت پاکستان ایسی مشکلات میں گھرا ہوا تھا کہ دستور سازی کے مسئلہ کی طرف توجہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

زیر قلم مقالہ میں جو "پاکستان کا مستقبل" کی صورت میں قارئین کے سامنے آ رہا ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ فلسفۂ خودی کی مختصر سی تشریح کر کے پاکستان کے سیاسی نظریہ کے طور پر اس کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت کروں۔ جب وزیر اعظم کی قرار دادِ مقاصد پیش ہو کر منظور ہوئی تو اس وقت یہ مقالہ لکھا جا چکا تھا، لیکن قرار داد کی منظوری سے مجھے اپنی معروضات میں کوئی تبدیلی کرنا ضروری نہیں ہوا کیونکہ اس قرار داد سے میری تجاویز کا وہ حصہ جس کی میں پہلے ہی توقع کر رہا تھا منظور ہوا ہے اور دوسرے حصہ کی منظوری کے راستہ میں سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ البتہ یہ قرار داد اس خیال کی اور تائید کرتی ہے کہ مستقبل کی عالمگیر ریاست پاکستان ہی ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کا ظہور پانا، پھر اس کا زیادہ مفصّل اور منظّم صورت اختیار کرنا، پاکستان کے ایک معجزہ کے طور پر وجود میں آنا اور پھر ایک ایسے ہی معجزہ کے طور پر ایک اسلامی ریاست بننا، یہ سب مستقبل کی اسلامی ریاست کی زندگی اور ترقی کے اسباب ہیں اور اس سلسلہ کی اگلی کڑی فلسفۂ خودی کو پاکستان میں اسلام کی سرکاری ترجمانی کے لیے کام میں لانا ہے اور پھر وہ کڑیاں جن کا ذکر میں نے مختصراً اس مقالہ میں کیا ہے اور جو پاکستان کو زمین کے کناروں تک پھیلا دیں گی اس کے بعد آئیں گی۔

اگر آپ اس مقالہ میں درج کی ہوئی معروضات میں سے کسی کی مزید تشریح یا تفصیل کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو میری کتاب آئیڈیالوجی آف دی فیوچر Ideology of the future کا مطالعہ کریں۔ اگر آپ فلسفۂ خودی کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے ہوں تو پھر آپ کا فرض ہے کہ آپ جہاں کہیں ہوں، اور جس حیثیت میں ہوں اور جہاں تک آپ کے لیے ممکن ہو، اس جہانِ تازہ کو جس کے ہیولیٰ کی اولین صورت اقبال کی صبحگاہی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی، ایک مکمل شکل دینے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اسلام اور کفر کی کشمکش

اس وقت ایک بحرانی نقطہ پر پہنچی ہوئی ہے۔ اگر فلسفۂ خودی پاکستان کا سرکاری نظریہ بن گیا تو یہ کشمکش فوراً اسلام کے حق میں اور کفر کے خلاف طے پا جائے گی۔ اگرچہ یہ یقین کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ فلسفۂ خودی پاکستان کا سرکاری نظریہ قرار پا نا قدرت کا اپنا مقصد ہے جو پورا ہو گا لیکن خدا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہم سے کام لینا چاہتا ہے۔ آیئے ہم اس کام کے لیے کمر ہمت باندھ لیں تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ اگر ہم نے آج سستی کی تو خدا تعالیٰ کے مقاصد تو نہ رکیں گے، البتہ ہمارا کوئی ٹھکانہ نہ ہو گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱
مرض

ہر سمجھدار مسلمان جو اپنی قوم کی موجودہ حالت پر دیانت دارانہ طریق سے اور جذبات سے الگ ہو کر غور و فکر کرتا ہے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ہم ایک ایسے شدید انحطاط کے دور سے گزر رہے ہیں جس کا نتیجہ ہمارے لیے نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ ہمارے دلوں سے اپنے نصب العین یعنی اسلام کی محبت یا تو بالکل ختم ہو چکی ہے یا اگر زندہ ہے تو شمع رہ گزر کی طرح جسے ہوا کے جھونکے ٹھیک طرح سے روشن ہونے کا موقع نہیں دیتے جو نہ جلتی ہے نہ بجھتی ہے اور جو اپنی زندگی کے لیے ہر وقت ایک ناکام کشمکش میں رہتی ہے یہ مسلّم ہے کہ اب اسلام ایک ایسی قوت نہیں رہا جو ہماری زندگی کے سارے افعال اور اعمال پر نگران اور حکمران ہو۔ آہستہ آہستہ ہم اس سے رخصت ہو رہے ہیں اور یہ ہم سے رخصت ہو رہا ہے۔ کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں جس سے اسلام نے روکا نہ ہو، لیکن کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں جس کے ہم مرتکب نہ ہو رہے ہوں۔ رشوت ستانی، چور بازاری، کنبہ پروری، جتھے بندی، دوست نوازی، جاہ طلبی، غدّاری، قومی بے حمیتی، اسراف، حرص، منافقت، جھوٹ، عیاشی، آرام طلبی، سہل انگاری، صوبہ پرستی، نسل پرستی غرضیکہ تمام رذائل جو قوم کی جڑ کاٹنے والے ہیں، دوسری قوموں سے بڑھ کر ہم میں

مسلمانوں کا انحطاط

موجود ہیں۔ اب اسلام سے ہمارا تعلق قریباً قریباً ایک رسمی یا روایتی حیثیت رکھتا ہے ورنہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں ہم اسلام سے الگ تھلگ نہ ہو چکے ہوں۔ مثلاً دستورِ حکومت ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ ہم نے پاکستان کو اسلام کے نام پر بنایا تھا، لیکن اب ہم سمجھتے ہیں (اور کسی حد تک جائز طور پر سمجھتے ہیں) کہ پاکستان کو ایک کامیاب اسلامی ریاست بنانا ایک ایسا کام ہے جس کی راہ میں ناقابلِ عبور مشکلات ہیں۔ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست نہ بنا سکے یا اسلامی ریاست بنانے کے بعد عملی طور پر اسلام کی ریاست کی روح رواں نہ بنا سکے تو یہ اس بات کا اعتراف ہوگا کہ ہم سمجھ چکے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام ایک سیاسی نظریہ کے طور پر ناقابلِ عمل ہے، اور جب اسلام عملی طور پر ایک مؤثر سیاسی نظریہ نہیں بن سکتا تو پھر زندگی کا کون سا شعبہ ایسا ہے جس پر اس کا اثر باقی رہ سکتا ہے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں کہ ہمارا نظامِ تعلیم، ضابطہ قانون و اخلاق، ہمارا نظامِ معاشیات اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلو درحقیقت ہمارے سیاسی نظریہ کے ماتحت صورت پذیر ہوتے ہیں۔ اہلِ یورپ کو دیکھ لیجیے کہ جب سے ان لوگوں نے پورے اختیار کے ساتھ اور جان بوجھ کر عیسائیت کو حکومت سے الگ کیا ہے، عیسائیت مردہ ہو کر رہ گئی ہے۔

اس صورتِ حالات کے باعث بعض مسلمان جو اعتقادی حیثیت سے پہلے ہی کنارہ ناامیدی پر تھے اور بھی زیادہ مایوس ہو گئے ہیں اور سمجھنے لگے ہیں کہ اب اسلام کے عروج کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور جس طرح سے تاریخ کا ہر تمدن یا نظریۂ زندگی اپنے وقت میں پیدا ہوا اور بڑھا اور پھولا اور خوب ترقی پاتا رہا، یہاں تک کہ بامِ عروج پر پہنچ گیا اور اس کا زوال شروع ہوا جو کسی کے روکے سے نہ رُکا، یہاں تک کہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اسی طرح سے اسلام کا روز افزوں تنزل بھی اس کی موت پر ختم ہوا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت بھی اسلام ایک بے جان یا نیم جان ڈھانچہ کی شکل میں باقی رہ گیا ہے اور مستقبل

قریب میں یہ بھی اشتراکیت کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کی تقدیر باقی تہذیبوں سے الگ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اسلام بھی ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے عروج کے کمال کو پہنچا۔ اس کا عروج صدیوں قائم رہا، اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ برابر انحطاط کی ڈھلوان پر لڑھکتا ہوا چلا جا رہا ہے، اور بظاہر تاریخ عالم ایک حد تک ان لوگوں کی قنوطی منطق کو بھی سہارا دیتی ہے، کیونکہ دنیا کی تاریخ درحقیقت نظریاتِ زندگی کے مٹنے اور اُبھرنے ہی کی تاریخ ہے۔

۲
پائیدار زندگی کی صلاحیتیں

اسلام کبھی مٹ نہیں سکتا

لیکن واقعاتِ تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنے کی بجائے اگر ہم ایک طرف اسلام کے بنیادی اصولوں اور دوسری طرف فطرتِ انسانی کے قوانین کا (جو دراصل تصوراتِ زندگی کے مٹنے اور اُبھرنے کا باعث ہوتے ہیں) گہرا علمی اور تنقیدی مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کریں تو ہمیں اس نتیجہ سے گریز نہیں آئے گا کہ اسلام کبھی مٹ نہیں سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس پیہم ترقی کی منزلوں کو طے کرتا ہوا آخر ایک ایسے دور میں پہنچ جائے گا جب اس کے مقابلہ پر دنیا بھر میں کوئی اور نظریۂ زندگی موجود نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک کامل نظریۂ زندگی ہے۔ لہٰذا وہی قوانین فطرت اور کائنات کی وہی مخفی قوتیں جو دوسرے ناقص نظریاتِ زندگی کو ابھارتی اور مٹاتی ہیں اسلام کو ہمیشہ قائم رکھنے بلکہ زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کے لیے عمل پیرا ہیں۔ قدرت ایک مکمل کامیابی کو مدتِ دراز کی جدوجہد کے بعد حاصل کرتی ہے اور جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو اسے مٹاتی نہیں، بلکہ اُسے کائنات کی آئندہ ترقی کے لیے سنگِ بنیاد کے طور پر کام میں لاتی ہے۔

اسلام کو ایک مکمل تصورِ زندگی قرار دینا بظاہر ایک خوش فہمی سی نظر آتی ہے کیونکہ تصوّرِ زندگی کی خصوصیتیں ہر قوم اپنے نظریۂ زندگی کو خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی ایک مکمل نظریہ سمجھتی ہے۔ لیکن یہ جاننے کے لیے کہ اسلام کیوں ایک مکمل نظریۂ زندگی ہے، اور اشتراکیت یا عیسائیت کیوں نہیں، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک نظریۂ زندگی کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور انسان کی نفسیات اور ارتقا کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ لہٰذا میں مختصر طور پر نظریاتِ زندگی کی خصوصیات کا ذکر کروں گا۔

نظریۂ زندگی Ideology. اعتقادات اور آرا کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے ایک انسان اپنے علم کے مطابق کائنات کا حل سمجھتا ہے، اور اسے اپنی خودی کے تقاضا کو پورا کرنے کے لیے قبول کرتا ہے۔ ہر انسان مجبور ہے کہ کائنات کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ قائم کرے۔ اور اس پر ایک ایسا پکّا اور سچّا اعتقاد رکھے جو فی الواقع اس کی زندگی کے سارے افعال پر مسلّط ہو۔ ایک فردِ بشر کے لیے کسی نظریۂ کائنات کو قائم کرنا اور باور کرنا اس قدر ضروری ہے کہ اگر وہ ایک نظریۂ زندگی کو ناکافی یا غیر تسلی بخش سمجھ کر چھوڑنا چاہے تو جب تک کسی اور نظریۂ زندگی پر اعتقاد قائم نہ کرلے، اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ غرضیکہ انسان اپنے نظریۂ زندگی سے ایک لمحہ کے لیے بھی الگ نہیں ہو سکتا۔ نظریۂ زندگی اس کے لیے خوراک سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ مشاہدہ میں آتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو انسان اپنے نظریۂ زندگی کی حفاظت کے لیے (خواہ وہ نظریۂ زندگی کسی نوعیت کا ہو) بھوکا رہنے بلکہ جان تک دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

> ہر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ کائنات کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ قائم کرے

نظریۂ زندگی کا سرچشمہ یا منبع درحقیقت فطرتِ انسانی کا وہ زبردست (انسان کے تمام نفسیاتی تقاضوں سے زیادہ قوی اور زیادہ زبردست) جذبہ Urge. ہے یعنی کششِ حسن ہے۔

> نظریۂ زندگی کا منبع انسان کی خودی کا قوی ترین جذبہ یعنی کششِ حسن ہے۔

جسے حسن و کمالِ معنوی کی کشش کہنا چاہیئے۔ یہ جذبہ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی تصور کی طرف حسن و کمالِ معنوی کی تمام صفات شعوری یا غیر شعوری طور پر منسوب کرے، خواہ یہ صفات اس تصوّر میں فی الواقع موجود ہوں یا نہ ہوں۔

تصوّرِ کامل کی خصوصیت

ظاہر ہے کہ انسان کا یہ فطری جذبۂ محبت صرف ایک ایسے تصوّر سے مستقل اور مکمل طور پر مطمئن ہوگا جس کے اندر حسن و کمال کے تمام وہ عناصر یا اوصاف فی الواقع موجود ہوں گے جنہیں ہم انسان ہونے کی حیثیت سے وہم و گمان میں لا سکتے ہیں، یا جن کی خواہش کر سکتے ہیں۔ ایسا تصوّر تصوّرِ کامل ہوگا۔ اور یہی ہماری فطرت کا اصل مقصود و مطلوب ہوگا، اور اگر کسی تصوّر میں ان صفات کمال میں سے جن کے لیے ہماری فطرت بے تاب ہے، ایک صفت بھی مفقود ہوگی۔ تو وہ تصوّر ہمیں آخر کار پوری تسلی نہ دے سکے گا۔ اور لہٰذا ناقص اور ناپائدار ہوگا۔

ناقص تصورات ناتسلی بخش اور ناپائیدار ہوتے ہیں

چونکہ انسان ٹھیک طرح سے یعنی ذاتی علم، تجربہ یا احساس کی بنا پر نہیں جانتا کہ تصوّرِ کامل فی الحقیقت کونسا ہے، اور چونکہ اس کا جذبۂ محبت ناقابلِ التوا اور ناقابل گریز ہے اور فوری اطمینان چاہتا ہے۔ اس لیے وہ بہتر علم کا انتظار نہیں کر سکتا اور مجبور ہوتا ہے کہ اپنے دائرہ علم کے اندر جو تصوّر اُسے فی الوقت بہترین نظر آئے، اُسی سے حسن و کمال کی تمام صفات جن کی تمنا اس کی فطرت کے اندر ودیعت کی گئی ہے منسوب کر دے۔ جیسے کہ ایک شخص جو اچھی خوراک نہ پا سکتا ہو بھوک سے مجبور ہوتا ہے کہ جو کھانے کو ملے اُسی سے اپنا پیٹ بھرے، اور اُسی میں لذّت و اطمینان پائے۔ ہر تصوّر جو ایک انسان اس طرح سے اختیار کرتا ہے، اسی قسم کا ہوتا ہے کہ اس میں اسے صفات کمال و حسن میں سے ایک یا چند صفات کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے اور پھر باقی ماندہ صفات کو وہ تحقیق کرنے کے بغیر اور غیر شعوری طور پر اس کی طرف منسوب کر کے ان کی موجودگی کا احساس کرنے لگتا ہے، کیونکہ اس کا تصوّر کیسا

ہی ناقص ہو، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے تقاضائے فطرت کا کوئی پہلو غیر مطمئن رہے۔ وہ کسی ایسے تصور کو پسند نہیں کر سکتا جس کے متعلق اُسے شبہ ہو کہ کوئی صفتِ کمال ایسی بھی ہے جو اس میں موجود نہیں۔ لہٰذا وہ جس تصوّر کو پسند کرتا ہے اُس کے متعلق جائز یا ناجائز اطمینان رکھتا ہے کہ اس کے اندر تمام صفات کمال موجود ہیں۔ لیکن درحقیقت جس قدر اس کا علم یعنی تجربہ یا احساس ناقص ہوگا اُسی قدر اس کا باور کیا ہوا تصوّر بھی ناقص ہوگا، اور جس قدر اس کے علم اور تجربہ کا دائرہ وسیع ہوگا اُسی قدر اس کے تصور کا معیارِ حسن و کمال بھی بلند ہوگا۔ تاہم جب کوئی انسان کسی تصور کو اختیار کرتا ہے تو اُسے زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہے، اور جب تک اس کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اس کے ساتھ پوری پوری عقیدت رکھتا ہے اور اپنی تمام زندگی کو اس کی خدمت اور اطاعت کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ گویا اسے ہر طرح سے وہی تصور خیال کرتا ہے جو درحقیقت کمال معنوی کی انتہا ہے اور جو اس کا

نظریاتِ زندگی کا ارتقا

اصلی مقصود و مطلوب ہے، لیکن چونکہ ایک ناقص تصوّر فی الواقع بعض صفات کمال سے عاری ہوتا ہے۔ اس لیے جب ہم کچھ عرصہ کے لیے اس کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری فطرت یا ہمارے تقاضائے حسن کے بعض عناصر کے ساتھ مزاحم ہو رہا ہے اور لہٰذا ناقص اور غیر تسلی بخش ہے۔ نہ صرف یہ کہ بعض صفات کمال اس میں نہیں، بلکہ جو صفات کمال اس میں نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی حقیقت بھی فریب نفس سے زیادہ نہ تھی۔

كَسَرَابٍۭ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْـَٔانُ مَآءً ۚ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَهُۥ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (۲۴ : ۳۹)

ترجمہ: چٹیل میدان کے سراب کی طرح جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

پھر ہم اس نظریہ سے الگ ہو کر دوسرے نظریہ کو اختیار کرتے ہیں نئے نظریہ کے اندر جہاں

تک ہمارا علم اور تجربہ کام کرتا ہے وہ صفات کمال موجود ہوتی ہیں جو پہلے تصور کے اندر موجود نہ تھیں۔ لہٰذا ہم اس نئے تصوّر کو اپنا اصلی مقصود و مطلوب خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور اس کی طرف بھی کمال کی باقی ماندہ تمام صفات کو اسی طرح سے بلا تحقیق اور غیر شعوری طور پر منسوب کر دیتے ہیں جس طرح سے ہم نے پہلے تصوّر کے بارہ میں کیا تھا۔ اب یہ نیا تصوّر بھی ہماری محبت کو پوری طرح جذب کر لیتا ہے اور ہم اس کی خدمت اور اطاعت میں لگ جاتے ہیں لیکن اگر یہ تصور بھی غلط ہو تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو پہلے تصوّر کا ہوا تھا اور ہم ایک تیسرے تصور کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ وعلی ھذا القیاس۔ ظاہر ہے کہ ہماری فطرت کے یہ تجربات تصوّراتِ زندگی کے ارتقاء کا ایک ذریعہ ہیں اور صرف اسی وقت تک جاری رہ سکتے ہیں جب تک ہم تصوّر کامل کو نہیں پا لیتے۔ یعنی اس کے صفات حسن و کمال کا ذاتی احساس نہیں کر لیتے۔ ہمارے اندازۂ حسن میں ایک تصوّر کا بلند ہونا، اور دوسرے کا گرنا ترازو کے دو پلڑوں کے گرنے اور اُبھرنے کی طرح بیک وقت عمل میں آتا ہے۔ اس لیے نئی تہذیبیں پرانی تہذیبوں پر فوراً تعمیر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

کامل نظام تصوّرات کی خصوصیت

جو تصوّر Idea زندگی کا نصب العین Ideal بنتا ہے اُس کے ماتحت اور تصوّرات پیدا ہوتے ہیں جو زندگی کا مکمل یا غیر مکمل طور پر احاطہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے ایک مرکزی یا بڑے تصوّر کے اردگرد ایک کامل یا غیر کامل نظام تصوّرات Ideology پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک کامل نظام تصوّرات وہ ہوگا جو تصوّرِ کامل کے اردگرد پیدا ہو اور انسان کی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر حاوی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر نظام تصوّرات جو تصوّرِ کامل کے اردگرد پیدا ہو، کامل نظام تصوّرات ہو۔

ہر نظام تصورات کا مرکزی نقطہ انسان کی فطرت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ سوال کہ انسان کیا ہے، کیا چاہتا ہے اور کائنات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ اس لیے ہر

نظامِ تصوّرات ایک نظریۂ کائنات یا ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اسی حد تک صحیح یا غلط، مدلّل یا غیر مدلّل، اور منظم یا غیر منظم ہوتا ہے جس حد تک کہ اس پر اعتقاد رکھنے والی سوسائٹی کا درجۂ علم اجازت دیتا ہو جس قدر فطرتِ انسانی کے متعلق ہمارا قیاس درست ہوگا، اُسی قدر ہمارا فلسفہ یا نظام تصوّرات بھی درست ہوگا۔

ارتقائے علم اور تصوّراتِ زندگی

نظام ہائے تصورات اس وقت سے دنیا میں موجود چلے آتے ہیں جب انسان پہلے پہل اپنے آپ سے آگاہ ہوا، اور اس نے اپنی ہستی اور کائنات کے باہمی تعلق کے بارہ میں سوچنا شروع کیا۔ اپنے ارتقاء کے ہر درجہ پر جو تصوّر بھی اسے کامل تصور نظر آیا۔ اُسی کو کائنات کی گتھی کا حل قرار دیا۔ اور خواہ وہ زبان سے کچھ کہتا رہا۔ لیکن دل سے اُسی کو اپنا اور کائنات کا خالق اور مالک قرار دیا، اور اُسی کو اپنی زندگی کا مدار اور محور بنایا۔ شروع شروع میں جب انسان کا علم ناقص تھا۔ اس کے نظام ہائے تصوّرات قدرت کی طاقتوں کی تجسیم Personification. ان کی وہمی توجیہات اور وہمی روایات Mythology پر مشتمل تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی نوعیت زیادہ معقول ہوتی گئی یہاں تک کہ اب وہ ایسے فلسفوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں جو عقلی طور پر پوری طرح سے مدلل اور منظم نظر آتے ہیں۔ انسان کی فطرت ایک مکمل ترین نظام تصوّرات کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ تمام علوم، فلسفے اور مذاہب اس تلاش کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ ہر شخص خواہ اس کا علم یا اعتقاد کسی درجہ یا نوعیت کا ہو، اپنا ایک مخصوص نظام تصوّرات یا نظریۂ زندگی رکھتا ہے۔ اس لیے فلسفے سے کسی کو گریز نہیں۔ البتہ بعض وقت ہمارا فلسفہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ عقلی طور پر مدلّل ہو سکے۔ اور بعض وقت ہمیں علم نہیں ہوتا کہ ہمارا فلسفہ عقلی طور پر مدلّل ہونے کی کس قدر صلاحیت رکھتا ہے۔

نصب العین کی بنیاد وجدان یا احساس ہے عقل نہیں

وہ نظامِ تصوّرات (درست یا غلط) جو فی الواقع ایک انسان کی زندگی پر حکمرانی کرتا ہے (وہ انسان ماہر ریاضیات

ہو یا فلسفی یا سائنسدان) کبھی کلیتہً ریاضیات یا منطق یا سائنس پر مبنی نہیں ہوتا خواہ اسے ماننے والا مطمئن ہو کہ عقلی طور پر وہ پوری طرح ثابت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوّرِ زندگی یا نصب العین کی بنیاد عقل پر نہیں۔ بلکہ وجدان Intuition. یا احساس Feeling. پر ہوتی ہے۔ ہم وجدانی طور پر ایک تصوّر میں حسن و کمال کا بلاواسطہ احساس کرتے ہیں اور اس کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ اگرچہ ہمارا وجدان یا احساس اکثر ہم کو غلط یا ناقص تصورات کی طرف لے جاتا ہے۔ تاہم ہمارے پاس تصورِ کامل کے لیے احساس یا وجدان کے سوائے اور کوئی راہ نما بھی نہیں۔ خود عقل وجدان کی خدمت گزار ہے، حکمران نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح وجدان سے پیدا ہونے والی عقل دوسروں کو صحیح وجدان کی طرف اور غلط وجدان سے پیدا ہونے والی عقل غلط وجدان کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ ایک نظامِ تصوّرات کبھی عقلی طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ ایک تربیت یافتہ، بے خطا اور سچے وجدان پر مبنی نہ ہو۔ ایسا وجدان ایک پیغمبر کا امتیاز ہے، اور اس کو ہم وحی کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے نظام ہائے تصوّرات جو عقلی کہلاتے ہیں (مثلاً اشتراکیت) درحقیقت عقلی طور پر درست نہیں بلکہ ایک غلط وجدان سے پیدا ہونے والی عقل پر مبنی ہیں۔

ایک تصوّر کا خاصہ ہے کہ وہ دوسرے افراد میں پھیل جاتا ہے۔ پھر افراد جو ایک ہی نظامِ تصوّرات پر اعتقاد رکھتے ہوں، ایک دوسرے سے کشش رکھتے ہیں، اور ایک جماعت بن جاتے ہیں جسے قوم یا فرقہ کا نام دیا جاتا ہے۔ جماعت کے اندر خود بخود ایک انتظام پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک حکومت یا ریاست کی شکل کو اختیار کر لیتی ہے۔ ہر نظامِ تصوّرات کی ایک الگ جماعت ہوتی ہے اور ہر جماعت کا اپنا الگ نظامِ تصوّرات ہوتا ہے جو اسے معرضِ وجود میں لاتا ہے اور اسے قائم رکھتا ہے۔ فرد کی طرح جماعت کا نصب العین بھی اس کے تمام اعمال پر حکمران ہوتا ہے۔ ہر نصب العین ایک خاص قسم کی تہذیب یا تمدّن

> ہر نصب العین ایک منظم جماعت یا ریاست پیدا کرتا ہے۔

کا مرکز بنتا ہے جو براہِ راست اس کے نتیجے کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ ہر نصب العین اپنا الگ فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ سیاست، ضابطہ قانون، نظامِ تعلیم اور ہنر پیدا کرتا ہے نصب العین اور جماعت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے وابستہ ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے کے ہم معنی الفاظ سمجھنا چاہیئے۔

ایک نصب العینی جماعت ایک جاندار وجود سے مشابہ ہے

انسانوں کی وہ جماعت جو کسی نصب العین کا واضح شعور رکھتی ہو Ideological Community. ایک جاندار وجود Living Organism. سے مشابہت رکھتی ہے۔ ایک جاندار وجود دیکھنے میں فردِ واحد ہے لیکن درحقیقت وہ لاکھوں افراد کی ایک جماعت ہے جو خلیات Cells. کہلاتے ہیں۔ اسی طرح سے ایک نصب العینی جماعت دیکھنے میں لاکھوں افراد پر مشتمل ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ اپنے افراد کے مشترک نصب العین کی وجہ سے ایک فردِ واحد کی طرح کام کرتی ہے۔ اور ایسے قوانین کے ماتحت ہے جو علم الحیات Biology. کے قوانین سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً ہر جماعت میں بحیثیت جماعت کے زندہ رہنے اور بڑھنے اور پھولنے کی خواہش اور استعداد ہوتی ہے اور جماعت کا نصب العین اسے زندگی یا روح کا کام دیتا ہے۔ جسم حیوانی کی طرح ہر آن اس کا ایک مدعا ہوتا ہے، جو نصب العین سے ماخوذ ہوتا ہے۔ اسی کی طرح یہ مزاحمت سے دوچار ہوتی ہے۔ اور اپنے مدعا کو حاصل کرنے کے لیے اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ پھر جدوجہد سے اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور جب جدوجہد چھوڑ دیتی ہے تو کمزور ہو جاتی ہے۔ جسم حیوانی کی طرح یہ خارجی اثرات سے جو اس کی صورت میں تصورات کی شکل اختیار کرتے ہیں، بیمار ہوتی اور مرتی ہے۔ اُس کی آخری موت کا اصلی سبب نصب العین کا فطرتی نقص ہوتا ہے جو اس کو بیماری سے جانبر نہیں ہونے دیتا۔ پھر ایک جاندار وجود ہی کی طرح ہر نصب العین (دوسرے تمام نصب العینوں کے ساتھ ایک کشمکشِ حیات میں مصروف ہے جس میں وہ مغلوب ہو کر فنا ہو

ہو سکتا ہے۔ جب ایک جسم حیوانی کے اعضا و جوارح میں پوری پوری یک جہتی ہو تو اس کی صحت کی بہترین حالت ہوتی ہے، اسی طرح سے جب ایک جماعت کے افراد اپنے مشترک نصب العین سے پوری پوری محبت رکھتے ہوں تو جماعت کی قوت اور تنظیم بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ ایک جاندار کی طرح ایک نصب العین ایسی چیزوں کو پسند کرتا اور کشش کرتا ہے جو اس کی بقا اور نشو و نما کے لیے ممد و معاون ہوں۔ اور ایسی چیزوں کو ناپسند کرتا اور دفع کرتا ہے جن کا اثر اس کے مخالف ہو۔ جس طرح سے ایک جاندار کی زندگی کا ضبط اور نظم اور لہٰذا قیام و بقا دماغ پر موقوف ہے، اسی طرح سے ایک نصب العین کا قیام و بقا اس کے قائد پر منحصر ہے۔

ہر نظام تصورات دوسرے نظام ہائے تصورات کے ساتھ مصروف پیکار ہے

ہر نظام تصورات یہ چاہتا ہے کہ اپنے معتقدین اور مددگاروں کی تعداد بڑھا کر اپنی طاقت اور دائرہ اثر کو وسیع کرے۔ چونکہ اس طرح سے ہر نظام تصورات ہر دوسرے نظام تصورات کے ممکن فائدہ کو نقصان میں بدلنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہر نظریۂ زندگی کا وجود دوسرے تمام نظریات کے لیے دعوتِ مبارزت ہے۔ یہی سبب ہے کہ نظام ہائے تصورات ایک باہمی جنگ میں مصروف ہیں جو کبھی پُرامن ہوتی ہے اور کبھی خونریز، لیکن جو پیہم جاری رہتی ہے۔ ارتقاء کی انسانی سطح پر نظام ہائے تصورات کی یہ جنگ اس جنگ سے مشابہت رکھتی ہے جو کرۂ ارض پر ظہورِ بشر سے پہلے اقسام حیوانات کے درمیان لڑی گئی اور جس کے نتیجہ کے طور پر زمین پر حیوان کامل یا انسان کا ظہور ہوا۔ اور جب انسان اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے میدان میں آیا تو ایک عرصہ بعد وہ اس قابل ہوا کہ زمین پر پورا پورا غلبہ حاصل کرے کیونکہ اسے باقی حیوانات پر ایک مجموعی برتری حاصل تھی۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں (اور یہ قیاس ہمارے دوسرے تمام نتائج کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے) کہ اسی طرح سے تصورات کی یہ جنگ ایک کامل نظریۂ زندگی کے ظہور اور غلبہ پر ختم ہوگی۔

تصورِ کامل حق تعالیٰ ہے کیونکہ حسن و کمالِ معنوی کی صفات میں سے کوئی صفت ایسی نہیں جو ہمارے خیال میں تو آئے یا جس کی خواہش تو ہم کر سکیں لیکن جو اس تصوّر کی طرف منسوب نہ ہو سکے

تصوّرِ کامل حق تعالیٰ ہے اور کامل نظام تصوّرات اسلام

نیز کوئی اور تصور ایسا نہیں جس کو ہم یہ تمام صفات پورے شعور اور احساس کے ساتھ منسوب کر سکیں اور کامل نظامِ تصورات اسلام ہے کیونکہ اس کا مرکزی تصوّر تصورِ کامل ہے اور اس کے گرد اگرد جو تصورات موجود ہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں۔

کیوں اسلام کے علاوہ کوئی اور مذہب کامل نظامِ تصوّرات نہیں

اسلام کے علاوہ کئی اور نظریاتِ زندگی جو مذاہب کہلاتے ہیں، ایسے ہیں جنہوں نے تصوّرِ کامل کے اردگرد ایک نظامِ تصوّرات پیدا کیا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی نظریہ زندگی ایسا نہیں جس کے بانی نے تصورِ کامل کو انسان کی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں تک پھیلایا ہو۔ یا اگر پھیلایا ہو۔ تو اس کا بہتر ریکارڈ تاریخ عالم میں موجود ہو۔ ان میں سے کسی نظریہ نے انسان کی اخلاقی زندگی کو نظر انداز کیا ہے کسی نے اجتماعی زندگی کو۔ اور زندگی کا سیاسی پہلو جو سب سے زیادہ اہم تھا۔ تقریباً سب کے ہاں مفقود ہے۔ لیکن بانیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عملی زندگی تصورِ کامل کو دنیا کے سامنے ایک کامل نظامِ تصورات کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ جو تاریخ کے باوثوق ریکارڈ میں ضبط ہے۔ کائنات (انسان کے ذریعہ سے جو کائنات کا حاصل اور ارتقاء کی شاہراہ ہے) اپنے کمال کو پہنچ کر رہے گی لیکن وہ کون سے عقائد اور اعمال ہوں گے جو انسان کے ارتقاء کا ذریعہ بنیں گے۔ یہ سمجھنے کے لیے دنیا کو ایک مثال کی ضرورت تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نے بہم پہنچا دی ہے گویا آپؐ کی زندگی نوعِ انسانی کے ارتقاء کی ایک چھوٹے پیمانہ کی تصویر ہے جسے دیکھ کر ہم انسان کے ارتقاء کی کیفیت کے بارے میں ایک یقینی تصوّر قائم کر سکتے ہیں اور لہٰذا پوری پوری راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

تصورِ کامل کے گرد پیدا ہونے والا ناقص نظامِ تصوّرات ناپائیدار ہوتا ہے

جب تصوّرِ کامل کے اردگرد ایک ایسا نظامِ تصوّرات پیدا ہو جائے جو کامل ہو تو وہ زندہ رہ سکتا ہے لیکن اگر تصوراتِ مل کے اردگرد پیدا ہونے والا نظامِ تصوّرات کامل نہ ہو (یعنی انسان کی زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر حاوی نہ ہو) تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جاندار کے اعضائے رئیسہ میں سے کوئی عضو ماؤف یا ناکارہ ہو جائے، تو اس کی زندگی نا دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ لیکن اگر اعضائے رئیسہ سلامت رہیں اور جسم کے کسی حصہ کا گوشت کٹ جائے تو جاندار مرتا نہیں۔ کیونکہ اعضائے رئیسہ کا فعل جسم کی نشوونما کو قائم رکھتا ہے اور جسم کے کٹے ہوئے گوشت کو جس حد تک کہ وہ بقائے حیات کے لیے ضروری ہو پھر پیدا کر لیتا ہے۔ انسان کی زندگی کے بعض شعبے ایسے ہیں جو ایک نظامِ تصورات میں خواہ وہ تصورِ کامل کے گرد پیدا ہو۔ زندگی کے کسی ایسے ہی ضروری پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی تعمیر میں خرابی کا سامان مضمر ہے اور اس کی زندگی کا عرصہ محدود ہے۔

اجتہاد کے معنی

لیکن اگر تصوّرِ کامل کے گرد پیدا ہونے والا نظامِ تصوّرات زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر حاوی ہو تو گو کسی وقت یہ محسوس کیا جائے کہ زندگی کی بعض جزئیات کے لیے اس کے ہاں تصورات موجود نہیں۔ لیکن اس سے نظامِ تصوّرات کی بقا خطرہ میں نہیں پڑ جاتی، بلکہ وہ بدستور زندہ رہتا ہے۔ اور تازہ حالات اور ضروریات کے مطابق مناسب تصورات اپنے اندر ہی سے پیدا کر لیتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔

عیسائیت کی مثال

ناپائداری کے اعتبار سے تصورِ کامل کے اردگرد پیدا ہونے والا ناقص نظامِ تصورات دونوں برابر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناقص نظامِ تصورات جو تصوّرِ کامل کے گرد پیدا ہوتا ہے ارتقاء سے کبھی کامل نہیں بنتا، بلکہ تصوّرات

باطلہ سے اپنی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ تمام کا تمام تصوّر کامل کے مرکز سے ہٹ جاتا ہے۔ چنانچہ عیسائیت کو یہی ماجرا درپیش آیا ہے۔ عیسائیت نے اپنے ہاں کے سیاسی تصورات کی کمی نیشنلزم Nationalism. سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب اکثر عیسائیوں کا حقیقی مقصود و مطلوب عیسائیت کا خدا نہیں بلکہ کوئی قوم یا وطن ہے اور عیسائیت کسی جگہ اور کسی شکل میں اس کا ردّ عمل نہیں دکھا رہی جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تصوّراتِ باطلہ سے مغلوب ہو کر عملی طور پر ختم ہو گئی ہے لیکن زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر شامل ہونے کی وجہ سے اسلام کے اندر باقوہ ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جو رہتی دنیا تک اس کے بقا اور ارتقا کی ضامن رہیں گی۔ بلکہ رفتہ رفتہ اسے تمام ناقص تصوّرات پر غالب کر دیں گی۔ ان صلاحیتوں کی وجہ سے اسلام تصوّراتِ باطلہ کے خلاف ردِّ عمل کرتا ہے اور ان سے مغلوب نہیں ہوتا بلکہ ان پر غالب رہتا ہے۔

اسلام کے آخری غلبہ کی وجوہات

ناقص نظام ہائے تصوّرات پر کامل نظامِ تصوّرات کے آخر کار غالب آنے کی وجہ یہ ہے کہ (۱) کامل نظامِ تصورات ان کے مقابلہ میں زندگی کا ایک برتر ظہور اور ارتقاء کا ایک اعلیٰ تر مقام ہے۔ (۲) ہمارے جذبۂ حسن و کمال کی پوری پوری تشفی کرنے کی استعداد رکھتا ہے۔ اور لہٰذا ہماری فطرت کے عین مطابق ہے۔ (۳) ناقص نظام ہائے تصوّرات کے اندر ان کی بربادی کا سامان موجود ہے (۴) ارتقا کی تمام قوتیں (جن میں حقائقِ عالم کے بارہ میں انسان کے علم کی ترقی ایک بہت بڑی قوت ہے) اسے تمام دوسرے تصوّرات پر غالب کرنے کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔

اسلام کا ظہور ارتقاء کے ایک اہم ترین دور کی ابتدا ہے

اسلام ارتقا کی کوئی اتفاقی یا ضمنی پیداوار نہیں بلکہ اس کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے جو ارتقا کی تمام آئندہ منزلوں کی بنیاد ہے۔ لاتعداد ناقص اور نادرست نظام ہائے تصوّرات کے درمیان اسلام کا ظہور اگر ارتقا کی کسی کامیابی کے ساتھ لگا کھاتا ہے تو وہ یا تو بے

جان مادہ سے بھری ہوئی کائنات کے اندر پہلے زندہ خلیہ Cell. کی پیدائش ہے۔ یا بے زبان حیوانات کی بے شمار اقسام کے درمیان پہلے حیوان ناطق کا ظہور ہے۔ اسلام کے مٹنے کا مطلب یہ ہوگا کہ قدرت نے خود اپنی ایک قیمتی کامیابی کو ضائع کرنا اور ارتقاء کے پہیے کو پیچھے کی طرف حرکت دینا پسند کرلیا ہے۔ اور یہ قطعاً ممکن نہیں۔ تاریخ ارتقاء کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ماضی میں زندگی کا برتر ظہور اپنی برتر اور بہتر قوتوں کے وجہ سے ہمیشہ نہ صرف اس قابل ہوتا رہا ہے کہ اپنے آپ کو برقرار رکھ سکے۔ بلکہ اس قابل ہوتا رہا ہے کہ زندگی کے نچلے درجات پر جو نسبتاً کمزور یا ناقص الخلقت ہوتے ہیں مجموعی طور پر یا آخر کار غالب آجائے۔ کیونکہ زندگی جب کسی بلند تر مقام پر قدم رکھتی ہے تو ارتقاء کو جلدی رکھنے کے لیے اس سے بھی اوپر ابھرتا رہتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے راستہ کی رکاوٹوں کو دور نہ کرلے۔ یعنی زندگی کے نچلے درجات پر غالب نہ آجائے۔ مثلاً جب پہلی زندہ خلیہ Cell. پیدا ہوئی تو یہ ارتقاء کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ قدرت نے اسے قائم رکھا۔ اور بے جان مادہ کے غلبہ سے اسے مٹنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ دنیا حیوانات کی کروڑوں گوناگوں اقسام سے بھر گئی۔ پھر جب انسان کا ظہور ہوا تو یہ ارتقاء کی دوسری بڑی کامیابی تھی اور قدرت نے خونخوار درندوں سے بھری ہوئی دنیا میں کمزور اور ناتواں انسان کو برقرار رکھا۔ بلکہ اسے وسعت اور فروغ دینی رہی۔ یہاں تک کہ انسان کرۂ ارض پر پھیل گیا۔ اور اقسام حیوانات انسان سے مغلوب ہوگئیں۔ اسلام کا ظہور بھی قدرت کی ایسی ہی بڑی کامیابی ہے جو متواتر وسعت پاتی رہے گی۔ یہاں تک کہ اسلام اپنی علمی، اخلاقی اور مادی طاقتوں کی مدد سے بالآخر تمام ناقص نظام ہائے تصورات کی مزاحمت اور مخالفت کو توڑ کر روئے زمین پر پھیل جائے گا۔ یہی مطلب ہے قرآن کے ان ارشادات کا:

اسلام کے آخری غلبہ کے بغیر ارتقاء جاری نہیں رہ سکتا

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۳۳:۹)

ترجمہ: وہی ذات پاک ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کے تمام دینوں پر غالب کرے گو مشرکوں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۳۲:۹)

(ترجمہ) "چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو منہ سے پھونک مار کر بجھا دیں۔ اور خدا کو منظور ہے کہ ہر طرح اپنے نور کو پورا کر کے رہے اگرچہ کافروں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔"

۳
مرض کے اسباب

جاندار وجود اور نظام تصورات کی مشابہت کے اور نکات

سوال یہ ہے کہ جب اسلام ایک پائدار نظام تصورات ہے جس کی قدرت خود محافظ اور نگران ہے۔ تو اس کا انحطاط کیوں ہوا۔ اس لحاظ کا خاص سبب کیا ہے۔ اور اس خاص سبب کے پیش نظر قدرت اس کے علاج کے لیے کیا صورت اختیار کر چکی ہے یا کرنے والی ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے ایک جاندار کے جسم اور ایک نظام تصورات (یعنی نظام تصورات کی حامل جماعت) کی باہمی مشابہت کے بعض اور نکات ہمارے سامنے آتے ہیں جس طرح سے ایک تندرست اور طاقتور جاندار کبھی کبھی مرض کا شکار ہوتا ہے، اسی طرح سے کامل نظام تصورات بھی ایک پائدار زندگی کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود کبھی کبھی انحطاط کے دور سے گزرتا ہے یعنی کبھی کبھی ایسی حالت سے دوچار ہوتا ہے جب اس

کے ماننے والوں کے دلوں میں اس کی محبت اور کشش کم ہو جاتی ہے۔ یہ گویا ایک ایسا مرض ہے جو اس کے جسم پر نہیں بلکہ ان کے شعور یعنی نفسیات اور جذبات پر مخالفانہ اثر ڈالتا ہے۔

مرض کے جراثیم اور تصوراتِ باطلہ

جب ایک جاندار وجود بیمار ہوتا ہے تو اس کے مرض کا سبب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ کسی بیماری کے جراثیم باہر سے آکر اس کے جسم میں داخل ہوتے ہیں اور اس کی قوتِ حیات کے ساتھ مزاحمت کر کے مرض کی حالت پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سے کامل نظامِ تصورات کی صورت میں افراد جماعت کے جذبات کی نادرستی یا بیماری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بیرونی غلط تصورات جو دوسرے غلط نظام ہائے تصورات سے نکلے ہوتے ہیں ان کو کشش کرنے لگ جاتے ہیں اور جس قدر ان تصورات کی محبت ان کے دلوں میں جاگزیں ہوتی جاتی ہے اسی قدر وہ اپنے نصب العین کی محبت سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔

اس دور میں جو ناقص تصورات ہمارے انحطاط کا موجب ہوئے ہیں، ان کا سرچشمہ مغرب کے غلط فلسفے یا غلط نظام ہائے تصورات ہیں جن کے بڑے بڑے امام میکیاولی۔ کارل مارکس۔ فرائیڈ۔ ایڈلر اور میکڈوگل ہیں۔ میکیاولی نے یورپ کو سکھایا کہ سیاست کا مذہب یا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں، اور حکمران کے لیے جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ جب ریاست کے مفاد کا تقاضا ہو تو جھوٹ، دغا، فریب مکر اور ظلم سے جس قدر چاہے کام لے۔ اور آج یورپ کے سیاست دان اور ان کے ایشیائی شاگرد امن، اخلاق، تہذیب، صداقت اور عدل کے نام پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی ریاستیں خواہ اُن کو یہ بات معلوم ہو یا نہ ہو اس وقت اسی فلسفہ پر قائم ہیں۔

نیشنلزم

اور یہ فلسفہ دنیا کا سب سے بڑا فتنہ ہے جس کی وجہ سے اہلِ عالم خالقِ ارض و

سماسے رُوگرداں ہوکر نیشنلزم کے بُت کے سامنے سربسجود ہیں۔ اسی نے نوعِ انسانی کو ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کردیا ہے، اور اسی کی وجہ سے عالمگیر جنگوں کا وہ خوفناک سلسلہ شروع ہوا جو اگر ختم نہیں ہوا تو ممکن ہے کہ روئے زمین سے انسان کی ہستی مٹ جائے لیکن پھر بھی دُنیا اس بُت کے حسن و جمال پر اس قدر فریفتہ ہے کہ اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔

اشتراکیت کارل مارکس کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب، اخلاق، فلسفہ، علم، ہنر اور ریاست جو انسان کے اعلیٰ ترین مشاغل تصور کیے جاتے ہیں، درحقیقت اپنی کوئی جداگانہ حیثیت یا قدر و اہمیت نہیں رکھتے، بلکہ سوسائٹی کے معاشی حالات کی پیداوار ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کی مادی یا اقتصادی ضروریات جن پر زندگی موقوف ہے۔ مثلاً کھانا، کپڑا، مکان وغیرہ آخر کار انسان کی تمام سرگرمیوں کی اصل یا جڑ ثابت ہوتی ہیں۔ یہ فلسفہ دنیا کے تقریباً نصف حصہ پر اپنی حکومت قائم کرچکا ہے اور دن بدن پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں اس کے خوف سے لرزہ براندام ہیں اور چونکہ وہ خود باطل پر قائم ہیں اور اُن کے پاس کوئی باطل شکن فلسفہ نہیں اس لیے ان کو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فلسفے کا مقابلہ کس طرح سے کیا جائے۔

فرائڈزم فرائڈ اس بات میں کارل مارکس سے متفق ہے کہ مذہب، اخلاق، صداقت، فلسفہ، ہنر اور سیاست اپنی کوئی جداگانہ حیثیت یا قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ لیکن اس کے خیال میں ان کی جستجو کا اصل سبب معاشی ضروریات نہیں بلکہ جنسی ضروریات ہیں۔ اس کے خیال میں جنس کی کشش Sex Urge۔ انسان کی تمام زندگی (جس میں اس کی معاشی ضروریات بھی شامل ہیں) کا مدار و محور ہے۔

ایڈلرزم ایڈلر انسان کی اعلیٰ ترین سرگرمیوں کا استخفاف کرنے میں مارکس اور فرائڈ دونوں کا ہمنوا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ انسان کے سارے اعمال و

افعال کی بنیاد حُبّ تفوق یا استیلا Urge for Power. ہے۔ میکڈوگل کا خیال ہے کہ انسان کی حیثیت ایک برتر قسم کے حیوان سے زیادہ ہے۔ کیونکہ انسان کی حیوانی جبلتیں animal instincts. جو اس میں اور اس کے نچلے درجہ کے حیوانات میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں، درحقیقت اس کی زندگی کی قوتِ محرکہ ہیں۔ ان فلسفوں کی وجہ سے دنیا میں ہر جگہ مذہب اور اخلاق کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔

اسلام کو فلسفہ کا زبردست چیلنج یہ فلسفے جو درحقیقت تمام فلسفوں کی طرح انسان کی فطرت کے نظریات ہیں، اسلام کو ایک زبردست چیلنج دیتے ہیں۔ کیونکہ اسلام بھی فطرتِ انسانی کے متعلق اپنا ایک فلسفہ یا نظریہ رکھتا ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ وہی نظریہ سچا اور بے خطا ہے۔ قرآن کے نزدیک اسلام انسان کی فطرت ہی کے قوانین کا نام ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۰ : ۳۰)

ترجمہ: تو اے پیغمبر تم ایک خدا کے ہو کر اس کے دین کی طرف اپنا رُخ کیے رہو۔ یہ خدا کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کی پیدا ہوئی فطرت میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

حضورؐ کی مندرجہ ذیل حدیث اس مضمون کی وضاحت کرتی ہے۔

مامن مولود الا یُولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

ترجمہ: ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں۔

ہمارا فرض تھا کہ ہم ان فلسفوں کا چیلنج قبول کرتے اُن کا جواب دیتے اور فطرتِ انسانی کے متعلق اسلام کی پوزیشن کو خالص علمی scientific نکتہ نظر سے درست ثابت کر کے دکھاتے۔ لیکن اس کی بجائے احساسِ کمتری ہمیں ایسا دامن گیر ہوا کہ ہم دانستہ طور پر ان سے خود متاثر ہوتے چلے گئے اور آج ہم میں سے اکثر تعلیمیافتہ اشخاص اگرچہ مسلمان بھی ہیں لیکن فطرتِ انسانی کے متعلق ان فلسفوں میں کسی نہ کسی فلسفہ کے بنیادی نظریہ کے بھی قائل ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کے یہ عقائد اسلام کے اس قدر مخالف ہیں کہ ان سے ہمدردی رکھنا اسلام سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں ان فلسفوں کی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں ہوتی رہتی ہے۔ ان دنوں نشر و اشاعت کے بعض ایسے ادارے وجود میں آئے ہیں جن کا کام فقط یہ ہے کہ فرائڈ اور ایڈلر کے نظریات کو نفسیات کے نام پر چھوٹی چھوٹی کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ سے پھیلایا جائے۔ اور یہ ادارے خوب روپیہ کما رہے ہیں۔ پھر ہم ترقی پسند ادب کے نام سے ایک ایسا لٹریچر پیدا کر رہے ہیں جس کی آخری بنیاد یہ ہے کہ کارل مارکس اور فرائڈ کے عقائد صحیح ہیں۔ اگر ہم اسلام کے نفسیاتی نقطۂ نظر کو ایک علمی شکل دینے کی کوشش کرتے اور اس میں کامیاب ہوتے اور ہماری کامیابی یقینی تھی (کیونکہ خدا سے زیادہ سچی اور معقول بات کون کہہ سکتا ہے) تو ہم ایک طرف اسلام کی صداقت کا ایک نیا بیّن ثبوت مہیا کرتے اور دوسری طرف علم النفس کے انتشار کا بھی ازالہ کرتے۔ وحی کے بغیر فلسفہ کے میدان میں انسان کی بے بسی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ فطرتِ انسانی کے متعلق عقلی قیاس آرائیاں کرنے والوں نے اب تک کم از کم علم النفس Psychology کے تیس مختلف نظریات پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ فلسفی جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، اُمّۃ الکفر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگرچہ ہمارے تعلیم یافتہ اشخاص میں سے کئی ایسے ہوں گے جنہوں نے ان کا نام بھی نہیں

ہماری بے بسی

تصوّرات مغرب کا بالواسطہ اور غیر شعوری اثر

سنا یا، اگر سنا ہے تو ان کا فلسفہ پڑھنے اور سمجھنے کا موقعہ نہیں پایا۔ لیکن پھر بھی ان کے افکار نے ہمارے عقائد کو متزلزل کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی علمی scientific. اور مادی ترقی اور سیاسی غلبہ کی وجہ سے ہم نے ان کے فلسفوں کا اثر زیادہ تر بالواسطہ Indirectly. اور غیر شعوری طور پر unconsciously قبول کیا ہے۔

جس طرح سے مرض کے جراثیم کے ایک محدود حصہ کو اپنا مرکز بنا کر وہاں سے اپنا ضرر رساں اثر تمام جسم میں پھیلاتے ہیں۔ کفر کے تصورات نے بھی ایک خاص مرکز سے اُبھر کر اپنا اثر و نفوذ تمام نوع انسانی میں پھیلا دیا ہے۔ اگرچہ ائمۃ الکفر کی تعداد زیادہ نہیں لیکن انہوں نے اپنے ماتحت لاتعداد چھوٹے چھوٹے امام پیدا کیے ہیں۔ پھر ان کے ماتحت یعنی ذہنی طور پر اُن کے زیر اثر ہزاروں لاکھوں تعلیمیافتہ اور ذہین انسان ہیں۔ جو اپنے اپنے حلقہ میں ان کے فلسفہ کے اثرات اور تصورات کو پھیلاتے اور قائم رکھتے ہیں۔ دنیا کا سارا لٹریچر ان اثرات سے بھرا پڑا ہے۔ دنیا کے سارے عالم اور ادیب اور دنیا بھر کے تمام ملکوں کے ذرائع نشر و اشاعت۔ پریس۔ پلیٹ فارم۔ ریڈیو۔ سینما۔ گھر۔ مدرسہ۔ ریاست۔ سوسائٹی۔ علمی، ادبی، تجارتی اور صنعتی انجمنیں اور جماعتیں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر ان کی تبلیغ کے لیے وقف ہیں۔ اس وقت دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کا نظام تعلیم ان فلسفوں سے پیدا ہونے والے تصورات سے گہری طرح متاثر نہ ہو۔ مختصر یہ کہ دنیا کی ساری ذہنی فضا ان تصورات سے اس طرح سے معمور ہے جیسے آسمان پر چاروں طرف سیاہ بادل چھائے ہوئے ہوں اور ہم جہاں جائیں، اُن کے سایہ میں رہیں۔

باطل کیوں مؤثر ہے

آپ کہیں گے کہ آخر باطل باطل ہونے کے باوجود اس قدر مؤثر کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطل کبھی خالصۃً باطل نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ حق و باطل کی آمیزش سے بنتا ہے۔ ہم اصل میں حق کی طرف جھکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ نادانستہ طور پر باطل کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ یہی شرک ہے۔ اور دنیا پر اسلام کا سب

نے بڑا احسان اور اسلام کا سب سے بڑا امتیاز بھی جو اس وقت کسی قدیم یا جدید مذہب کو حاصل نہیں اور جو اسے آخری اور صحیح ترین نظریۂ زندگی کی حیثیت سے فی الواقع حاصل ہونا چاہیئے تھا یہ ہے کہ اس نے تصوّر کامل اور اس سے اخذ کیے ہوئے تمام تصوّرات حقہ کو باطل کے ہر ممکن شائبہ سے پاک رکھنے کی تاکید کی ہے۔

انحطاط کی علامات اس کے اسباب نہیں

اس زمانہ میں ہمارے بعض مفکّرین نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب کا کھوج لگایا جائے تاکہ قوم اُن کا ازالہ کر کے پھر عروج کی طرف مائل ہو۔ لیکن اکثر مفکّرین کی پرواز خیال اس سے اُوپر نہیں گئی کہ انہوں نے انحطاط کی علامات کو ہی انحطاط کی وجہ یہ ہے کہ ان کی اخلاقی حالت نہایت پست ہے۔ ان میں ضبط discipline نہیں۔ اتحاد نہیں۔ قربانی کا مادہ نہیں خودداری نہیں۔ عزتِ نفس نہیں۔ دیانت داری نہیں، محنت سے کام کرنے کی عادت نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس کے برعکس وہ خود غرضی، بددیانتی، حرص اور لالچ کا شکار ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ذاتی اغراض کے لیے قومی مفاد کو نظر انداز کر دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں اور ان کے بدترین دشمن اُن میں ہی سے ہوتے ہیں۔ اگر مسلمان دوسری قوموں کی طرح ضبط discipline قربانی، دیانت داری، خودداری اور محنت کی عادت پیدا کر لیں۔ تو اُن کا انحطاط عروج میں بدل جاتا ہے وغیرہ۔

بعض مفکرین اس سے ذرا آگے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے انحطاط کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے قرآن اور سنت پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں کسی تقریر یا تحریر کی ضرورت نہیں۔ بلکہ عمل اور فقط عمل کی ضرورت ہے۔ عمل ہی سے ہم اپنے گھر کو درست کر سکتے ہیں اور عمل ہی سے دوسری قوموں کو متاثر کر کے اُن کی ہدایت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ عمل بالقرآن تبلیغ دین کا صرف ایک ہی صحیح اور کامیاب طریقہ ہے۔ لوگ نصیحت سے نہیں بلکہ مثال سے اثر قبول کرتے ہیں۔ اگر آج مسلمان پھر قرآن اور سنت پر

عمل کرنے لگ جائیں تو ان کی قسمت بدل سکتی ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔

لیکن یہ باتیں ہمارے عوارض کو بیان کرتی ہیں، عوارض کے اسباب کو بیان نہیں کرتیں۔ اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہہ دے کہ مریض کو بخار اس لیے ہے، کہ اس کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے یا اسے زکام اس لیے ہے کہ اسے چھینکیں آتی ہیں ہمارے سامنے اصل سوال یہی تو ہے کہ جب اور قوموں کی اخلاقی حالت درست ہے تو ہماری اخلاقی حالت درست کیوں نہیں۔ ہم میں ضبط اور اتحاد کیوں نہیں۔ ہم میں قربانی کا مادہ خودداری عزت نفس اور دیانت داری کے اوصاف کیوں نہیں۔

ہم کیوں سست ہیں۔ اور محنت اور تندہی سے کام کیوں نہیں کر سکتے۔ ہم مسلمان کہلانے کے باوجود قرآن اور سنت سے کیوں منحرف ہیں۔ اور اُن پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ درحقیقت ان تمام سوالات کا صرف ایک جواب ہے۔ اور وہ یہ ہے مسلمان قوم کو اپنے نصب العین سے کوئی محبت نہیں رہی اور زوالِ محبت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل مغرب کے غلط تصوّرات سے متاثر ہیں۔ کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں ہوتے۔ یہ قطعاً ممکن نہیں تھا کہ مسلمانوں کے دل مغرب کے غلط تصوّرات کی طرف بھی مائل ہوتے۔ اور پھر وہ اسلام کے بھی ویسے ہی معتقد رہتے۔ ان تصوّرات نے مسلمانوں کی متاعِ دین و ایمان کو اس صفائی سے لوٹا ہے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ اقبالؒ اس حقیقت کی طرف ایک بلیغ اشارہ کرتا ہے۔

انحطاط کا سبب غلط فلسفوں کا اثر ہے

متاعِ دین و دانش لُٹ گئے اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

زندگی کی ساری کل کو حرکت میں لانے والی قوت فقط ایک ہے اور وہ نصب العین کی محبت ہے۔ نصب العین مختلف درجوں اور بلندیوں کے ہوتے ہیں۔ ہر نصب العین اپنا الگ ایک قانونِ اخلاق رکھتا ہے جس پر اس نصب العین

عمل یقین محکم کا نتیجہ ہے

کو ماننے والے بشرطیکہ وہ دل سے اس کو مانتے ہوں، نصب العین کی اندرونی کشش کی وجہ سے پوری رغبت کے ساتھ اور کسی بیرونی مجبوری کے بغیر عمل کرتے ہیں جس قدر کوئی نصب العین بلند ہوتا ہے یعنی اپنے اوصاف کے لحاظ سے تصور کامل کے قریب ہوتا ہے، اسی قدر اس کا قانون اخلاق بھی بلند ہوتا ہے۔ اور جس قدر کوئی نصب العین پست اور ناقص ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کا مقرر کیا ہوا قانونِ اخلاق بھی پست اور ناقص ہوتا ہے، تاہم جس قدر کوئی قوم اپنے نصب العین سے زیادہ محبت رکھے گی اسی قدر وہ اس نصب العین کے مقرر کیے ہوئے قانونِ اخلاق پر سختی سے عمل کرے گی۔ اس وقت دنیا کی ہر قوم کا نصب العین ناقص اور پست ہے۔ لیکن چونکہ دنیا کی ہر قوم اپنے نصب العین سے شدید محبت رکھتی ہے وہ اس کے مقرر کیے ہوئے قانونِ اخلاق پر (اگرچہ وہ ایک پست اور ناقص نصب العین کا قانونِ اخلاق ہونے کی وجہ سے پست اور ناقص ہے) شدت کے ساتھ عمل کرتی ہے۔ اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتی کہ اس راہ میں اسے کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں میں اپنے نصب العین کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کرنے کی استعداد ہے۔

کافر کی سبقت کی وجہ

اس کے برعکس گو مسلمان کا نصب العین صحیح اور بلند ہے اور اس کا قانون اخلاق بھی ویسا ہی صحیح اور بلند ہے لیکن چونکہ مسلمان اپنے نصب العین کی محبت سے محروم ہیں۔ وہ اس کے قانون اخلاق پر بھی عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کافر بہت سی باتوں میں مسلمان پر سبقت رکھتا ہے ؎

کافر بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

تقدیر یا آخرت کا عقیدہ ہمارے انحطاط کی وجہ نہیں

بعض مفکرین نے ہمارے انحطاط کی ایک اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ ہم تقدیر کے قائل ہیں اور لہٰذا جد وجہد سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ یہ مقولہ بھی فطرتِ انسانی کے اس بنیادی اصول کو نظر انداز کرتا

ہے کہ نصب العین یا مدعا کی محبت ہمارے اعمال کا سرچشمہ ہے اور ہمارے تمام عقائد و اعمال نصب العین کے خدمت گار ہیں، اس کے حکمران نہیں۔ اگر نصب العین کی محبت قوی ہو تو تقدیر کا عقیدہ ہمیں ایسے عمل سے باز نہیں رکھ سکتا جو اس محبت کا تقاضا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا ممد و معاون بن جاتا ہے۔ تقدیر کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کے بھی قائل ہیں کہ تقدیر اسباب کے ذریعہ سے اپنے مقاصد کو پاتی ہے اور ہم کو خدا کی تقدیر کا علم نہیں۔ بلکہ فقط ان اسباب کا علم ہے جو بالعموم تقدیر کو صورت پذیر کرتے ہیں۔ جب ہمارے دل میں ایک نصب العین یا مدعا کی شدید محبت یا خواہش پیدا ہوتی ہے تو ایک زبردست اندرونی دباؤ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم وہ عمل اختیار کریں جو ہمارے تجربہ کے مطابق بالعموم اس کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور تقدیر کا عقیدہ اس دباؤ میں کمی نہیں کرتا بلکہ اور اضافہ کرتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہم یہ نہیں کہتے کہ "میں یہ کام نہیں کرتا اگر میری تقدیر میں کامیابی لکھی ہوگی تو میرا مدعا خود بخود حاصل ہو جائے گا"۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کام کو بلا خوف و خطر کر گزرنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر میرا چارہ نہیں اور اس میں جو خطرہ یا خوف مجھے محسوس ہوتا ہے وہ خدا کی تقدیر کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھے گا۔ یعنی اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو تو ہم تقدیر کو ترک عمل کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ کیا کوئی تقدیر کا ماننے والا یہ کہتا ہے کہ میں آج کھانا نہیں کھاتا۔ اگر تقدیر میں ہوگا، تو خود بخود سیر ہو جاؤں گا یا میں آج سے اپنے کام پر حاضر نہیں ہوں گا۔ اگر تنخواہ میری قسمت میں ہوگی تو مجھے مل جائے گی۔ یا کیا اگر ایسا شخص دشمنوں سے گھرا ہوا ہو اور اسے اچانک نجات کی واضح راہ مل جائے۔ تو وہ کبھی کہتا ہے کہ میں اس راہ کو اختیار نہیں کرتا۔ اگر تقدیر میں ہوگا، تو مجھے خود بخود نجات میسر آئے گی۔ یا کیا اگر وہ ایک تجارتی معاملہ صریحاً سود مند پاتا ہو تو نفع کو مقدر سمجھ کر کبھی اس معاملہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ ہم عمل کو ہمیشہ اس وقت ترک کرتے ہیں۔ جب مدعا کی صحت اور اس کے حصول کے اسباب کی صحت پر ہمارا عقیدہ کمزور ہو

جاتا ہے۔ یعنی جب مدعا (جس میں اس کے حصول کے اسباب بھی شامل ہیں) کی محبت کمزور ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم ترکِ عمل کے لیے عذرات تراشتے ہیں جن میں تقدیر بھی ایک عذر ہے۔ ہمیشہ ترکِ عمل پہلے ہوتا ہے اور تقدیر کا عذر یا دوسرے عذرات بعد میں ہوتے ہیں۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ ہم عمل کو کلیتہً ترک نہیں کرتے بلکہ ایک عمل کو ترک کر کے فوراً دوسرے عمل کو اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ اس دوسرے عمل کے لیے بھی تقدیر کا عذر اسی طرح پیش کیا جا سکتا ہے جس طرح سے پہلے عمل کے لیے جو ترک کیا گیا ہو۔

مسلمان کا قدم واپس نہیں جا سکتا

اگر دوسری قوموں کی طرح مسلمان وطنیت جیسے کسی پست نصب العین سے شدید محبت پیدا کر لیں تو وہ بھی دوسروں قوموں کی طرح محدود قسم کی اخلاقی خوبیوں سے آراستہ ہو کر ایک محدود عرصے کے لیے کچھ عروج اور ترقی حاصل کر سکتے ہیں لیکن خواہ مسلمان اسلام سے پوری طرح عقیدت رکھیں یا نہ رکھیں اسلام جیسے ایک کامل نظامِ تصورات سے ایک دفعہ آشنا ہونے کے بعد ان کے لیے ممکن نہیں رہا کہ اب وہ کسی پست نصب العین سے ایک ایسی شدید محبت پیدا کر سکیں جو غیر مسلم قوموں کے لیے ممکن ہے۔ مسلمان قوم کے لیے واپس جانے کا راستہ کوئی نہیں، صرف آگے جانے کا راستہ موجود ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں تو ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ پھر اسلام ہی سے اپنی محبت کو زندہ کریں۔ اور اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ اس محبت کی راہ میں مغرب کے غلط تصورات نے جو رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں پہلے ان کو ہٹائیں۔ اگر مسلمان اسلام سے اپنی پہلی محبت کو پھر زندہ کر لیں (اور یہ ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا ہونا ضروری ہے) تو پھر ان کو دوسری قوموں کی طرح عارضی عروج نہیں بلکہ اختتامِ تک عروج حاصل رہے گا۔

تعلیم یافتہ طبقہ

مغرب کے تصوراتِ ضلال نے ہماری سوسائٹی کے مختلف طبقوں کو مختلف طرح سے متاثر کیا ہے۔ تعلیم جدید سے بہرہ پانے والے بعض مسلمانوں کے

معتقدات تو بری طرح مجروح ہوئے ہیں۔ وہ شریعت کے اخلاقی محاسبہ سے بیزار اور اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوس ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اب مذہب کا زمانہ گزرا چاہتا ہے اور اب ہمیں زیادہ سے زیادہ اسلام کو وہی حیثیت دینا چاہیے جو مغرب کے لوگوں نے عیسائیت کو دی ہے۔ ان میں سے بعض کمیونسٹ کہلاتے ہیں اور فقط ترقی پسند مسلمان لیکن غیر اسلامی افکار و آراء کی محبت اور حمایت میں سب یکساں ہیں۔ جدید تعلیم پانے والے مسلمانوں کا دوسرا گروہ ایسا ہے کہ اگرچہ اس پر مغربی تصورات کی پوری زد پڑی ہے اور اس کے عقائد متزلزل ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ ان سے کلیتہً الگ نہیں ہوا۔ وہ مغربی تصورات کے ساتھ ایک کشمکش میں مصروف ہے جو اسے ناکام ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم اس گروہ کے دل ابھی اسلام کی محبت سے خالی نہیں ہوئے۔

قدامت پرست علماء

ان کے عین مقابل میں علماء کا وہ گروہ ہے جو مغربی تصورات کو خطرناک سمجھ کر ان سے کلیتہً محترز رہنا چاہتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ سلامتی اسی میں ہے۔ یہ علماء بہر حال تمام ترقیوں کو روک کر واپس جانا چاہتے ہیں حالانکہ خود اسلام نے انہیں آگے بڑھنے کے لیے کہا ہے۔ لیکن ان کو آگے بڑھنے کے لیے کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ براہِ راست نئے تصورات کے اثر سے محفوظ ہیں۔ لیکن بالواسطہ اس سے متاثر ہیں۔ کیونکہ ان میں ایک احساسِ کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی ایسی کمی ہے جس کی وجہ سے وہ اس زمانہ کے آدمی نہیں۔ یہ احساسِ کمتری اس بات کی واضح علامت ہے کہ ان کے ایمان اور اطمینان قلب کو نقصان پہنچ چکا ہے۔

جدت پسند علماء

تیسرا گروہ ان علماء کا ہے جو جدت پسند کہلانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اسلام کی شدت rigidity سے گھبرا کر اور کافرانہ تصورات سے للچا کر جہاں جہاں سلامت کوش علماء کی روش کے خلاف قدامت پرستی کے دائرہ سے

قدم باہر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بصیرت اسلامی سے محروم ہونے کی وجہ سے باطل کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ خواہ ان میں کوئی مفسر قرآن تھا یا معلم حدیث۔ یہ لوگ کبھی کبھی اپنے آپ کو اسلام سے بچھڑا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ اب اسلام اسی بات کا نام ہے۔ اور اس کے ثبوت میں قرآن اور حدیث سے بظاہر نہایت مضبوط دلائل مہیا کرتے ہیں۔ ہندوستانی قومیت اور اکھنڈ ہندوستان کے حامی علماء اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جہادِ ناتمام

چوتھا گروہ اُن علماء کا ہے جو اپنی استعداد کے مطابق اسلام کو تصورات باطلہ سے محفوظ کرنے اور آخر کار اسلام کو ان پر غالب کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں۔ لیکن کامیاب نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو وہ خود تصورات باطلہ پر ٹھیک طرح سے حاوی نہیں اور دوسرے یہ کہ ان کے پاس کوئی ایسا فلسفہ نہیں جو ایک مؤثر علمی حربہ کا کام دے اور جس کی مدد سے وہ مغرب کے تصورات کو ان ہی کے قلعہ میں گھس کر شکست دے سکیں۔ فلسفہ کا جواب ایک فلسفہ ہی ہو سکتا ہے۔ ایک فلسفے کی کامیاب تردید کا طریقہ یہ نہیں کہ ہم اُس کے بعض انفرادی تصورات کو لے کر ان کے نقائص بیان کریں۔ اس سے ہمارا حریف سوائے اس کے اور کوئی اثر قبول نہیں کرتا کہ معترض جس فلسفہ پر اعتراض کر رہا ہے اس سے خود واقف نہیں۔ اور اس کی بات ٹھیک ہوتی ہے۔ بلکہ ایک فلسفہ کی کامیاب تردید کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مقابل میں ایک اور فلسفہ مہیا کیا جائے جو اس سے زیادہ منظم اور معقول اور زیادہ قابل قبول ہو اور جس کے تسلیم کر لینے سے مقابل کا فلسفہ خود بخود ناقابلِ تسلیم ہو جائے۔ خود مغربی فلسفہ نے بھی مذہب کی براہِ راست تردید نہیں کی۔ بلکہ انسان اور کائنات کی ایسی عقلی تشریح کی ہے جو مذہب کے لیے گنجائش باقی نہیں چھوڑتی۔ تاہم ان علمائے کرام کو صرف ان تصورات کے خلاف عَلَم جہاد بلند کرنے کی وجہ سے (خواہ یہ جہاد کرنے کے سارے حربے اُن کے پاس موجود ہیں یا نہیں) مسلمانوں کے ایک طبقہ میں

ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیائے اسلام اپنے عارضہ سے جلد ہی شفایاب ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ علماء کرام بھی تصوّراتِ باطلہ کے اثر سے محفوظ نہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے (اور ایک منظم اسلامی فلسفہ کی عدم موجودگی میں ایسا ہونا متوقع بھی تھا) کہ باطل کے مقابلے کے لیے ان کے دلائل نادانستہ طور پر خود باطل ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ مغربی تصوّرات کا ضرر رساں اثر کس قدر مخفی اور گہرا ہے اور اس زمانہ میں حق و باطل کا امتیاز کس قدر مشکل ہے۔ علماء کے یہ تینوں طبقات ان حکومتوں اور صداقتوں سے مستفید نہیں جو نئے تصوّرات کے اندر باطل کے ساتھ لپٹی ہوئی موجود ہیں اور جو درحقیقت نورِ قرآن کی بکھری ہوئی اور ظلمت کفر میں کھوئی کرنیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کا علم ترقی پا کر آگے نکل گیا ہے اور وہ پیچھے رہ گئے ہیں اور اس قابل نہیں رہے کہ قرآن کو زمانہ حال کے علم اور تجربہ کے مطابق سمجھا سکیں۔

صحیح ردِّ عمل کیا تھا

تصوّراتِ مغرب کے خلاف ہمارے علماء کا صحیح ردِّ عمل یہ تھا کہ وہ ان فلسفوں کی طرف رجوع کرتے جو اُن کے اصلی ماخذ ہیں۔ پہلے اُن پر ہمدردانہ غور کر کے ان کو ٹھیک طرح سے سمجھ لیتے اور پھر یہ دیکھتے کہ ان کے بانیوں نے اپنے اپنے استدلال میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں اور کیوں؟ ایسا کرنے سے وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سے الگ کرتے اور ایک نئے سچے عالمگیر فلسفہ کی داغ بیل ڈالتے جس کی مدد سے نہ صرف اپنی قوم اور تمام دنیا کو ضلالت سے بچاتے بلکہ دنیا کے علم کو اغلاط سے پاک کر کے منزلوں آگے لے جاتے اور آئندہ نسلوں کو شکر گزاری کا موقعہ دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

اسلام کے مدِّ مقابل فلسفے ہیں مذاہب نہیں

اور عین اس وقت جب کہ یورپ کا فلسفہ سارے مذاہب کو جڑ سے اُکھاڑ رہا تھا ہمارے علماء و مشائخ اور مناظر، ویدک دھرم، عیسائیت، اور دوسرے مذاہب کی تردید میں لگے ہوئے تھے اور ہم

سمجھتے تھے کہ اسلام کی بڑی مدافعت ہو رہی ہے۔ ہم نے مدت تک نہیں سمجھا کہ اس زمانہ میں اسلام کا مدِ مقابل کوئی مذہب نہیں بلکہ یورپ کا فلسفہ ہے جو تمام مذاہب کو چیلنج دے رہا ہے اور جو مذہب اس فلسفے کے مقابل میں قائم رہ سکے گا وہی زندہ رہے گا۔ ہم نے دوسرے مذاہب پر جو اس فلسفہ کے اثر سے پہلے ہی مر رہے تھے اور ضربیں لگائیں لیکن خود اس فلسفہ سے ٹکر لے کر اپنی حفاظت کا سامان نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ فلسفہ دوسرے مذاہب پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد کمیونزم، نیشنلزم اور نفسیات جدید کے پھندے ہاتھ میں لیے ہوئے ہمیں بھی اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔

علماء کی خدمتِ دین

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے انحطاط کی تمام ذمہ داری اس گروہ پر ڈال دیں جنھوں نے دین کا علم حاصل کر کے کسی قدر اس فرض کو ادا کیا جو قوم کے ہر فرد پر عائد ہوتا تھا۔ اس کے برعکس ہمیں اس گروہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی وجہ سے سخت مشکل کے زمانہ میں بھی ہم نے مِنْ حَیْثُ الْقَوْم اپنی مقدس کتابوں سے کچھ نہ کچھ تعلق قائم رکھا جس سے آئندہ موافق حالات میں ایک سچی اسلامی زندگی ابھر سکتی ہے۔ ورنہ مستقبل میں جب ہم پر اسلام کی عظمت کے آشکار ہونے کا وقت آتا تو قرآن اور حدیث کے نسخے بھی کسی عجائب خانہ سے تلاش کرنا پڑتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے علماء حالات کی وجہ سے اس پوزیشن ہی میں نہ تھے یا کم از کم ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ مغرب کے فلسفہ کے خلاف صحیح قسم کا ردِّ عمل کر سکتے۔

دوست نما دشمن

ایک تو ہمارے حریف کے الجھنے کا طریق ایسا تھا کہ ہمیں مدتوں خبر نہ ہوئی کہ کوئی ہمارے ساتھ الجھ رہا ہے۔ اس کا ظاہری لباس ایسا جاذبِ نظر تھا اور اس کی باتیں ایسی محبت آمیز کہ ہمیں اس پر دشمنی کا گمان بھی نہ ہوا، بلکہ ہم نے اسے دوست سمجھ کر اس پر اعتماد کیا۔ اور اس سے راہ و رسم پیدا کی۔ اس کے علاوہ مغرب کے فلسفہ کے نیک و بد کی جانچ پڑتال کے لیے قرآن اور حدیث کی واقفیت کے علاوہ

اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ ہمارے علماء خود اس فلسفہ سے پوری طرح واقف ہوتے لیکن غلامی کی وجہ سے دینی تعلیم اور مغربی تعلیم کو یک جا کرنا ممکن نہ تھا۔

ہماری اکثریت مجبور تھی کہ روزگار کا مسئلہ حل کرنے کے لیے علم دین سے الگ رہے

مغربی تعلیم اور دینی تعلیم کا افتراق

اور مغربی تعلیم پاکر مغربی فلسفہ کی مخالفت نہیں بلکہ حمایت اور ہمنوائی کا سبق سیکھے۔ ان میں ہماری قوم کے بہترین دل و دماغ بھی تھے۔ جو مقابلہ کے امتحانوں کے ذریعہ سے چن چن کر ہم سے الگ کر لیے گئے تاکہ اسلام کی حفاظت کی بجائے انگریزی سلطنت کی حفاظت کے لیے اپنی قوت فکر و عمل کو صرف کریں۔ اس کے بعد بہت تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی رہ گئی جو خاندانی روایات کی وجہ سے یا اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے فکر معاش سے بے پروا ہو کر علم دین کی طرف متوجہ ہوئے اور علماء دین بنے۔ ایسے لوگوں کے لیے مغربی فلسفہ کے تحقیقی مطالعہ کا موقع کہاں سے پیدا ہوتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر مغربی فلسفہ اور علوم دین دونوں میں پوری پوری دسترس ایک ساتھ موجود بھی ہوتی تو پھر بھی فلسفہ مغرب کے غلط اور صحیح تصورات میں امتیاز کرنے کے لیے ایک ایسی پختہ اور تربیت یافتہ اسلامی بصیرت اور روح قرآن سے ایک ایسی قریبی واقفیت کی ضرورت ہے جو درس و تدریس سے یا لغات اور تفاسیر کے مطالعہ سے نہیں بلکہ ایک سچے مومن کو اعلیٰ روحانی مقام پر ہی حاصل ہو سکتی ہے اور جس کا میسر آنا، بالخصوص الحاد کی رونق کے اس زمانہ میں، نہایت مشکل ہے۔

قرآن کی ماہیت

قرآن کوئی ایسی کتاب نہیں جسے کسی مصنف نے لکھ کر یا لکھوا کر دوسروں کے سرتھوپ دیا ہو کہ تمہارا جی چاہے یا نہ چاہے اس پر عمل کرو ورنہ تمہیں آگ میں جھونکا جائے گا۔ بلکہ قرآن انسان کے تحت الشعور کا وہ بے پناہ اور ناقابل گزیر جذبۂ حسن ہے جس کے اظہار اور اطمینان کے لیے ہر شخص بے تاب ہے لیکن اس کے اظہار کی صحیح راہ نہیں پاتا۔ لیکن جب ایک مومن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں مخلصانہ طور پر

اور کثرت سے خدا کی عبادت کرتا ہے تو اس کا جذبہ حسن سطح شعور پر ظاہر ہو جاتا ہے اور اپنے صحیح مقصد کو پا کر اطمینان حاصل کرتا ہے۔ معرفت کے اس درجہ پر ایک انسان کو یوں نظر آتا ہے کہ وہ گویا اپنی آنکھوں سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ کر رہا ہے اور یہ کیفیت اس کے دل کو انتہائی سرور اور لذت سے بھر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے بڑے زور دار الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (۱۳ : ۲۳)

(ترجمہ) وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن کے دل خدا کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ خبردار ہو کہ خدا کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔

یہی احسان کا درجہ ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا:

الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ (رواہ بخاری)

(ترجمہ) "احسان کے معنی یہ ہیں کہ تو خدا کی عبادت اس طرح سے کرے کہ گویا تو اُسے دیکھ رہا ہے۔"

قرآن کا علم

مشاہدہ حق کے اس مقام پر مومن کو ایک علم دیا جاتا ہے جس سے دین کے رموز و اسرار اس پر آشکارہ ہوتے ہیں اور وہ حقائق دینی کا ذاتی احساس کرتا ہے لہٰذا اس مقام پر وہ احکام شریعت اور اصول و اخلاق کی پابندی مجبوری سے نہیں بلکہ ایک ایسی رغبت اور خواہش سے کرتا ہے جس کا روکنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اُسے قرآن کے مطالب سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اصل قرآن جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا اس پر عیاں ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنی فطرت کے قرآن کو جو اب اس کے لیے ایک زندہ اور متکلّم قرآن کی حیثیت اختیار کر چکا ہوتا ہے اس قرآن سے جو کتاب کی صورت میں اس کے سامنے ہوتا ہے مقابلہ کر کے دیکھتا ہے

تو دونوں کو ایک دوسرے کے عین مطابق پاتا ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹:۴۹)

(ترجمہ) بلکہ یہ قرآن واضح آیات پر مشتمل ہے جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

قرآن کی اصطلاح میں علم سے دینی حقائق کی ایسی واقفیت مراد نہیں جو درس وتدریس، تفسیر اور عربی زبان کی لغت اور گرامر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ——

قلبی مشاہدہ بلکہ حقیقت کا وہ ذاتی مشاہدہ تجربہ یا احساس ہے جس کی بنا پر ایک انسان خدا اور اس کے فرشتوں کی طرح اپنے ذاتی علم سے قرآن کی صداقت کی گواہی دے سکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کا علم رکھتے ہیں ان کے لیے قرآن نے اولوا العلم، راسخون فی العلم الذین اوتوا العلم اور علماء کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِىْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط

ترجمہ:۔ بلکہ یہ قرآن واضح آیات پر مشتمل ہے جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جو علم دیے گئے ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ط (۳ : ۱۸)

ترجمہ: خدا گواہی دیتا ہے اور نیز فرشتے اور علم والے لوگ گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل وانصاف کے ساتھ کارخانہ عالم کو سنبھالے ہوئے ہے۔

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج (۳:۷)

ترجمہ: اور اللہ کے سوائے اس کا مطلب کسی کو معلوم نہیں۔ اور جو لوگ علم میں بڑی پایگاہ رکھتے ہیں صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵ : ۲۸)

ترجمہ: خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں ایسے علماء کثرت سے پیدا ہوں گے۔

قرآن کے داخلی علم کے بغیر قرآن کو خارجی ذرائع سے سمجھنے کی کوشش خواہ ان میں لغت کی موشگافیوں اور گرامر اور منطق کی باریک بینیوں سے کتنا ہی کام لیا جائے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ بلکہ مضر ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسلام میں فرقوں کے اختلافات ان ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ مطالب قرآن کا اندرونی علم ایسا ہے جیسے دن کے وقت راستہ پر چلنا اور اس کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے لیے ذہنی کاوش سے کام لینا ایسا ہے جیسے تاریکی میں راستہ ٹٹولنا۔ جو لوگ قرآن کا داخلی علم حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کو قرآن کے مضامین و مطالب ازبر ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس علم کے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ مغز ماری کے باوجود اس کے مطالب پر حاوی نہیں ہو سکتے۔

فطرت انسانی قرآن کی محافظ ہے

اگر ہر انسان کے دل میں قرآن کی اصل نہ ہوتی تو نبوت کا اختتام نوع انسانی کو ہلاکت کے لیے چھوڑ دیتا کیونکہ قرآن کی تشریح اور تفسیر کے بارہ میں ہمارے اختلافات روز بروز بڑھتے چلے جاتے۔ حتیٰ کہ وہ قرآن جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا، ہماری غلط تعبیرات میں کھو کر رہ جاتا۔ لیکن نبوت کے علاوہ انسان کو ایک اور ایسا راہ نما بھی دیا گیا ہے جو مستقل طور پر اس کے پاس موجود رہتا ہے۔ اور یہ اس کی فطرت کا وہی جذبہ حسن ہے جو اپنے اظہار اور اطمینان کے کمال کو پہنچ کر ایک زندہ اور متکلم قرآن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کے اس جذبۂ حسن کی وجہ سے اب یعنی

اختتام نبوّت کے بعد قدرت ان تمام مقاصد کو آسانی سے حاصل کر سکتی ہے جو اختتام نبوّت میں پوشیدہ رکھے گئے تھے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کو رفتہ رفتہ ایک ہی شخص (خاتم انبیاء) کی روحانی قیادت میں کامل ترین نظریہ زندگی پر جمع کیا جائے۔ اب جوں جوں کائنات کا ارتقاء ہوگا یعنی جوں جوں نوع انسانی اپنے جذبۂ حسن کا زیادہ سے زیادہ اظہار اور اطمینان کرنا سیکھے گی، وہ قرآن کو زیادہ صحیح، زیادہ واضح اور زیادہ منظم طریق سے سمجھنے لگے گی اور ہمارے اختلافات (اسلام کے اندر یا باہر) خواہ اس وقت کتنے ہی شدید نظر آتے ہیں، رفتہ رفتہ کم ہوتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ آخر کار بالکل مٹ جائیں گے اللہ کی کتاب ہماری فطرت کی راہنمائی کرتی ہے اور ہماری ہدایت یافتہ فطرت کتاب اللہ کے مفہوم کو بگڑنے نہیں دیتی۔ اور اس طرح سے کتاب اللہ اور فطرۃ اللہ جو اصل میں دونوں ایک ہیں دونوں ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵ : ۹)

ترجمہ: بے شک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان بھی ہیں۔

انسان کے فطرتی جذبۂ حسن ہی کی وجہ سے ایک پیغمبر خدا کی وحی پاتا ہے اور اسی کی وجہ سے ایک غیر معمولی ذہانت کے انسان Genius کے دل میں علمی صداقتوں کا القاء ہوتا ہے۔

نبوت اور سائنس

علمی صداقت کا القا ایک قسم کی وحی ہے پیغمبر کی وحی اور غیر معمولی ذہانت کے انسانوں کی وحی (جس حد تک کہ وہ فی الواقع صداقت کو پاتی ہے۔) دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔ بلکہ مدد و معاون ہیں کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی ابدی سچائیوں کی پردہ کشائی۔ دونوں کائنات کی گتھی کو سلجھاتی ہیں۔ اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پیغمبر کی وحی غلطی سے پاک ہوتی ہے اور ذہین انسان کے مدرکات میں غلطی کے عنصر کا ہونا بھی ممکن ہے۔

لیکن یہ غلط عنصر پیغمبر کے علم کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے اور آخر کار ذہین انسان کی علمی جستجو سے جو حقائق دستیاب ہوتے ہیں وہ وحی نبوّت کی تشریح اور تفصیل مہیا کرتے ہیں اور اس طرح سے دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ قرآن دین ہے اور دین فطرتِ انسانی اور فطرت انسانی جذبۂ حسن۔ چونکہ تلاش صداقت جذبۂ حسن کی تشفی اور تسکین کے لیے ہے۔ اس لیے انسان کا ذہن کوئی ایسی علمی حقیقت دریافت نہیں کر سکتا جو فی الواقع ایک سچی علمی حقیقت تو ہو، لیکن قرآن کی تشریح اور تفسیر نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۴ : ۳)

ترجمہ:۔ اور آسمانوں اور زمینوں میں ذرّہ بھر چیز اُس سے پوشیدہ نہیں اور ذرّے سے چھوٹی یا ذرّہ سے بڑی کوئی ایسی چیز نہیں جو واضح کتاب میں موجود نہ ہو۔

چونکہ علم کی کوئی حد نہیں۔ اس لیے قرآن کی تشریح اور تفسیر کی بھی کوئی حد نہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۸ : ۱۹)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ ہو تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ہم ویسا ہی سمندر اس کی مدد کو اور لائیں۔

علم قرآن کی نشوونما قیامت تک جاری رہیگی

قرآن ایک ایسے پودے کی طرح سمجھ لیجیے جو اچھی زمین میں بویا گیا ہو۔ اور اُسے دھوپ ہوا اور پانی کافی مقدار میں میسر ہو۔ پھر وہ شاخیں اور پتے نکالتا ہے۔ اور زمین میں اس کی جڑ زیادہ گہری اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان درخت بن جاتا ہے جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ سائنس اور فلسفہ کی ہر ترقی خواہ وہ دنیا کے کسی

مقام پر اور کسی شخص کی باتوں سے ظہور میں آئے۔ قرآن کے درخت میں ایک نیا پتہ، ایک نئی شاخ یا ایک نیا پھول یا پھل ہے۔ چونکہ علم کی ترقی جاری رہے گی اور علم نبوت کی رہنمائی میں آخر کار اغلاط سے پاک ہوتا رہے گا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی شاخیں، پھل پھول اور پتے قیامت تک نکل نکل کر نوعِ انسانی کو بہارِ حسن دکھاتے رہیں گے اور اس کی ہر قسم کی ترقیوں کو ممکن بناتے رہیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب قرآن کے علم کا درخت پھیل کر تمام کائنات کا احاطہ کرے گا اور دنیا کا سارا علم اپنی ساری وسعتوں کے باوجود فقط قرآن ہی کا علم ہوگا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴ : ۲۴)

ترجمہ:۔ خدا نے پاکیزہ بات کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی طرح بیان کی جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنیاں آسمان میں ہوں اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل لاتا رہے۔

اچھی زمین جس میں قدرت نے قرآن کا پودا اگایا ہے، فطرتِ انسانی ہے جس میں جذبۂ حسن ودیعت کیا گیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵ : ۴)

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت کا پیدا کیا۔

اور دھوپ، پانی اور ہوا انسان کا ماحول ہے جو اس کے جذبۂ حسن کو اکساتا اور اُسے نئے نئے علمی انکشافات پر مائل کرتا ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (۳ : ۱۹۰)

ترجمہ:۔ بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے اختلاف میں

عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

نئی شاخیں اور نئے پتے جو پودے کے اُگنے سے رونما ہوتے ہیں، درحقیقت نئے نہیں ہوتے بلکہ پودے کے اندر اس وقت سے موجود ہوتے ہیں جب وہ ابھی بیج کی حالت میں تھا۔ جس طرح سے ایک پودا جب اُگتا، بڑھتا اور پھولتا ہے تو بدلتا نہیں، بلکہ فقط اپنے آپ سے باہر آتا جاتا ہے، اسی طرح سے گوارتقائے علم سے قرآن ایک پودے کی طرح بڑھتا اور پھولتا ہے لیکن بدلتا نہیں بلکہ اپنے مخفی علوم کا اظہار کرنے سے اور مفصل اور مشرح ہوتا چلا جاتا ہے۔ قرآن کا علم جس قدر نشو ونما پائے گا، قرآن اسی قدر جوں کا توں رہے گا۔

قرآن کا موجودہ ترقی یافتہ علم

اگر ہم خود مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو اسلام کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآن کے اُس علم سے جو پیہم ترقی کر رہا ہے، اپنے آپ کو وقف کو کھیں اور اس غرض کے لیے یہ ضروری ہے کہ اگر ہم علمی میدان میں دوسروں کے راہنما نہ ہوں تو کم از کم دوسروں کی علمی ترقیوں کے دوش بدوش رہیں۔ تاکہ جوں جوں علم ترقی کرتا جائے۔ ہم اس میں سے حق و باطل کا امتیاز کرتے ہوئے باطل کو چھوڑتے اور حق و صداقت کو اپنے ساتھ لیتے چلے جائیں۔ یہی مطلب تھا حضورؐ کے اس بیان کا

طلب العلم فریضة علی کل مسلم (مشکوٰۃ)

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

سارا علم علم دین ہے

لیکن ہم نے علم کو علم دین تک اور دین کو قرآن اور حدیث کے الفاظ تک محدود کر دیا حالانکہ اس وقت جس قدر صحیح اور سچا علم دنیا میں موجود ہے، یا آئندہ زمانوں میں انسان کی ذہنی کاوش سے پیدا ہونے والا ہے، وہ علم دین کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔ اس زمانہ میں علوم کی ترقی قرآن کے علم کو بہت آگے لے گئی ہے لیکن ہم دین کے

وہیں ہیں۔ بلکہ قرآن آگے جارہا ہے اور ہمارا رخ پیچھے کی طرف ہے۔

ہم قرآن کے تازہ علم سے جو انسان کے قلم کی بدولت صدیوں میں جمع ہو ہو کر اس معیار پر پہنچا ہے بے اعتنائی کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ اسی خدا نے انسان کو دیا ہے جس نے قرآن نازل کیا تھا اور جس نے خود قرآن میں اس علم کو ایک بخشش اور عنایت کے طور پر یاد کیا ہے۔

اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (۹۶:۴-۵)

ترجمہ:۔ وہ جس نے آدمی کو قلم کے ذریعے علم سکھایا اُس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

تمام علم صداقتیں ہماری ہیں

اگر ہم یورپ کے فلسفے کا جو اس وقت ہمارے لیے ایک مصیبت بنا ہوا ہے تنقیدی مطالعہ کرتے تو یہی ہمارے لیے ایک رحمت بن جاتا۔ آئن سٹائن۔ پلانک۔ کارل مارکس۔ میکیاولی۔ ہیگل۔ کانٹ۔ فرائڈ۔ ایڈلر۔ برگسان۔ ڈارون۔ میکڈوگل اور اس قسم کے دوسرے لوگوں نے جو کچھ دنیا کو بتایا ہے وہ سب کا سب غلط اور بیکار نہیں، بلکہ اس کے اندر نہایت قیمتی اور پاکیزہ صداقتیں بھی ہیں جو باطل کے ساتھ ملوث ہو کر پڑی ہیں اور یہ صداقتیں تمام قوموں سے بڑھ کر ہماری ہیں کیونکہ ہمارے قرآن کی تشریح اور تفسیر ہیں اور ہم ہی اُن کے وارث اور امین مقرر ہوئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا (ترمذی)

ترجمہ:۔ دانائی کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے پس جہاں اُسے مل جائے (یعنی مسلمانوں کے ہاں سے ملے یا غیر مسلموں کے ہاں سے) اس کا زیادہ حق دار وہی ہے۔

ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم ایمان کی روشنی میں ان صداقتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور باطل سے انہیں الگ کر کے باطل کا طلسم توڑتے اور حق کی رونق کو بڑھاتے لیکن جیسا کہ

میں عرض کر چکا ہوں حالات ایسے تھے کہ ہم اس فرض کو ادا نہیں کر سکتے تھے اور اس سلسلہ میں جو جو فروگذاشتیں اور کوتاہیاں ہم سے ہوئیں وہ ناگزیر ہیں۔

عروج مرض کی علامتیں

بیماری کے عروج کی حالت میں طبیعت کے صحت بخش رجحانات جو آخر غالب آتے ہیں عارضی طور پر مغلوب ہو جاتے ہیں۔ مغرب کے غلط تصوّرات نے ایک مزمن مرض کے جراثیم کی طرح خود ایسے حالات پیدا کر لیے جن کی وجہ سے ان کے لیے ممکن ہوا کہ عرصۂ دراز تک ہماری مزاحمت کو روکے رکھیں۔ ہمارے دلوں سے رفتہ رفتہ اسلام کی محبت کو جو ہمارے لیے قوتِ حیات vitality کا حکم رکھتی ہے سلب کرتے جائیں اور خود زیادہ سے زیادہ ان کی جگہ متمکن ہوتے جائیں۔ ان کی ہر کامیابی نے ان کی اگلی کامیابی کو اور ہماری اگلی شکست کو آسان کیا اور اس طرح سے ہم شکست پر شکست کھاتے چلے گئے۔ ہمارا انحطاط جس نے اس وقت ہمیں موت کے رُوبرو کھڑا کر دیا ہے، درحقیقت ہماری پے در پے شکستوں کے اسی سلسلہ کا نام ہے۔

۴

مرض کا علاج

جسم حیوانی کے مرض کا علاج

جب ایک طاقت ور اور تندرست جسم حیوانی میں بیماری عروج پانے لگتی ہے، تو قدرت کا انتظام ایسا ہے کہ اس کا علاج ایک قدرتی اور بیساختہ ردِّعمل کی صورت میں خود بخود اس کے اندر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی جاندار کے وجود کے اندر نہایت سرعت کے ساتھ ایسے مواد پیدا ہوتے ہیں جو کیفیتِ مرض کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور جو مرض کے جراثیم کا مقابلہ کر کے ان کو برباد اور بے کار کر دیتے ہیں۔ یہ مواد جاندار کے جسم میں بالقوہ موجود ہوتے ہیں، لیکن ضرورت کے وقت نمودار ہوتے ہیں اور جب تک ضرورت ختم نہیں ہوتی یعنی جب تک مضر صحت جراثیم ہلاک نہیں ہو جاتے یہ مواد بڑھتے

اور ترقی کرتے جاتے ہیں۔ یہ مواد ہر مرض کے لیے مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں اور ڈاکٹروں کی اصطلاح میں ان کو اینٹی باڈیز antibiotics اور اینٹی ٹاکسنز antitoxins کہا جاتا ہے۔ اس قدرتی ردِ عمل کی وجہ سے جاندار کے خون کے اندر ایک ایسی مستقل تبدیلی واقع ہوتی ہے جو نہ صرف وقتی طور پر مرض کا ازالہ کرتی ہے بلکہ جو آئندہ بھی عرصہ دراز تک یا ہمیشہ کے لیے مرض کے حملوں کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹروں نے بعض امراض کو روکنے کے لیے جو ٹیکے ایجاد کیے ہیں ان کا اصول یہی ہے کہ مرض کو ایک خفیف صورت میں پیدا کر کے طبیعت کو ردِ عمل پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے جسم کے اندر دافع امراض مواد ظہور میں آجاتے ہیں اور مرض کا حملہ ناممکن ہو جاتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ کئی امراض کی صورت میں آج تک مرض کو روکنے کے لیے مرض کو پیدا کرنے سے بہتر اور کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ مرض جو اگر خیریت سے گزر جائے جسم کے لیے ایک رحمت بن جاتا ہے کیونکہ اس سے جسم کی مخفی قوتیں جو مرض کو روکنے کے لیے فطرت نے اس میں رکھی ہیں بروئے کار آجاتی ہیں اور اس کی آئندہ کی صحت کی ضامن بن جاتی ہیں۔

کمزور جاندار کا ردِ عمل ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا

یوں تو ہر جاندار وجود مرض کے خلاف قدرتی ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے لیکن ردِ عمل کی کامیابی کا انحصار جاندار کی طاقت صحت اور عام صلاحیت کے اس معیار پر ہے جو اُسے مرض سے پہلے حاصل ہو۔ اگر جاندار وجود پہلے ہی کمزور، نحیف یا ناقص الخلقت ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ مرض کے حملہ سے جانبر نہ ہو سکے۔

وجود اجتماعی کے مرض کا علاج

بالکل یہی اصول ایک وجود اجتماعی social organisms یا نظام تصوّرات کی صورت میں کام کرتا ہے۔ جب ایک نظام افکار مخالف تصورات کا شکار ہوتا ہے تو وہ بھی ان تصوّرات کے خلاف ایک قدرتی ردِ عمل کرتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر اُس کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اس نظامِ افکار کی گمراہیوں

سے نئے تصورات پیدا کرتے ہیں جو مخالف تصوّرات کا مقابلہ کر کے ان کو بے کار اور بے معنی بنا دیتے ہیں اور نظامِ افکار کو ایک نئی زندگی اور طاقت بخشتے ہیں۔ جاندار کے جسم میں پیدا ہونے والے دافع امراض مواد یعنی اینٹی باڈیز antibodies کی طرح یہ نئے تصوّرات درحقیقت نئے نہیں ہوتے بلکہ شروع سے مخفی طور پر نظامِ افکار کے اندر موجود ہوتے ہیں اور ضرورت کے وقت نمودار ہوتے ہیں اور جب تک ضرورت ختم نہیں ہوتی یعنی جب تک مخالف تصوّرات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا برابر ترقی پاتے اور زور پکڑتے رہتے ہیں اور فوری ضرورت کی تکمیل کے بعد نظامِ افکار کا ایک مستقل جزو بن جاتے ہیں جس سے نظامِ افکار اُن تصوّرات کے حملے جن کے مقابلہ کے لیے وہ پیدا ہوتا ہے۔ آئندہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔

یوں تو ہر نظامِ افکار خواہ ناقص ہو یا کامل اپنے مخالف تصوّرات کے خلاف ایک قدرتی ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن ناقص نظامِ تصورات کی صورت میں ضروری نہیں کہ یہ ردِّ عمل ہمیشہ کامیاب ہو۔ کیونکہ ایک ناقص نظامِ تصوّرات میں حسن و کمال کے تمام عناصر (جن سے ردِّ عمل درحقیقت اپنی قوت حاصل کرتا ہے) موجود نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس ضروری ہے کہ ناقص نظامِ تصوّرات پر ایک وقت ایسا بھی آئے جب مخالف تصوّرات جن کے خلاف اُسے ردِّ عمل کرنا پڑے، اس نوعیت کے ہوں کہ وہ اپنے فطری نقص کی وجہ سے ان کے مقابلہ کی استعداد نہ رکھتا ہو اور اُن سے جانبر نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ناقص نظامِ تصوّرات ہمیشہ ناپائدار ہوتا ہے۔

ناقص نظامِ تصورات کا ردِّ عمل ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتا

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۱۴:۲۶)

ترجمہ:۔ ایک ناپاک تصوّر اس درخت کی طرح ہے جو زمین سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ اُسے پائداری نہیں۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ

اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو دوست بناتے ہیں ایسی ہے جیسے مکڑی جس نے گھر بنایا ہو۔ بیشک گھروں میں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہے۔ کاش کہ وہ جانتے ہوں۔

لیکن ایک کامل نظام تصورات جس میں حسن و کمال کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں،

کامیاب ردِ عمل کامل نظامِ تصورات کا خاصہ ہے

ہمیشہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے مخالف باطل تصورات کے خلاف زود یا بدیر ایک کامیاب اور صحت بخش ردِ عمل کر سکے۔ قرآن حکیم نے اس اصول کو یوں بیان کیا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ (۲۱: ۱۸)

ترجمہ: ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں۔ پس وہ باطل کا سر کچل دیتا ہے جس سے وہ ناگہاں مٹ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک کامل نظامِ تصورات پائدار ہوتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ (۱۴: ۲۴)

ترجمہ: ایک پاکیزہ بات کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی طرح جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں بلند ہوں اور وہ خدا کے حکم سے ہر وقت پھلتا رہے۔

کامل نظام تصورات پر غلط تصورات کے حملے اگرچہ اُسے کچھ عرصے کے لیے کمزور اور بیمار کر دیتے ہیں۔ لیکن اسے مٹاتے نہیں بلکہ ایک جاندار کے صحت میں بدل جانے والے مرض کی طرح اس کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لا کر اس کی پائدار صحت، طاقت اور درازیٔ عمر کا

سامان بن جاتے ہیں ۔ چنانچہ اسلام اپنے مخالف فلسفیانہ تصورات کے خلاف ہمیشہ کامیاب ردِّ عمل کرتا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک زندہ ہے اور اب بھی دنیا کے کسی غلط نظریہ میں اشتراکیت کے خلاف صحت بخش ردِّ عمل کرنے اور اس سے بچ نکلنے کی صلاحیت موجود نہیں اور اس کے برعکس یقینی بات ہے کہ اسلام نہ صرف اشتراکیت سے بچ نکلے گا بلکہ اشتراکیت اس کے ساتھ ٹکرا کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی ۔

فلسفۂ خودی باطل تصوّرات کے خلاف اسلام کا ردِّ عمل ہے

اس زمانہ میں مغرب کے غلط تصورات کے خلاف اسلام کا قدرتی ردِ عمل اقبال کے فلسفہ خودی کی صورت میں نمودار ہوا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ان تصوّرات کو مردہ اور بے اثر کر کے دنیا کی آخری قوم کو ایک نئی زندگی اور نئی قوت دی جائے اور پھر اس سے موجودہ دنیا کی اصلاح کا کام لیا جائے۔ فلسفۂ خودی کی صورت میں حق زمانہ کے باطل کے خلاف نبرد آزما ہوا ہے تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے راستہ سے ہٹا دے اور صرف اسلام ہی کو نہیں بلکہ تمام دنیا کو اس سے نجات دلائے۔ چونکہ باطل نے فلسفہ کی صورت اختیار کی تھی ، اس لیے حق نے بھی ایک فلسفہ کی صورت اختیار کی ہے ۔ اور چونکہ باطل تازہ علوم اور جدید طرز استدلال سے آراستہ ہوا تھا اس لیے حق بھی اس کے مقابلہ میں تازہ علمی حقائق اور علمی طرز استدلال سے آراستہ ہوا ہے تاکہ باطل کو اس کے اپنے ہی آلات اور اسلحہ کی مدد سے شکست دے ۔

اقبال کی موزونیت

اقبال میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو خاتم النبیین کی امت کے کسی فرد کو اس زمانہ کے غلط تصوّرات کے خلاف حق و صداقت کے قدرتی ردِّ عمل کا آلہ کار بننے کے لیے موزوں بنا سکتی تھیں ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مغرب کے فلسفیانہ تصوّرات کے تار و پود سے بخوبی واقف تھا اور یہ واقفیت اسے ان تصوّرات کے نیک و بد کی پہچان کا اہل بناتی تھی ۔ وہ خود کہتا ہے ؎

چو نتوانے دانائے اسرارِ فرنگ　　　کس نکو نہ نشست در تارِ فرنگ

طلسم عصر حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خداوندا کہ مانند براہیم بنار او چہ بے پروا نشستم

دوسری بات یہ ہے کہ تصوّف اور خدا پرستی کے ساتھ ایک خاندانی مناسبت رکھنے کی وجہ سے اُسے دین کا علم (جو درحقیقت ایک قسم کی روحانی استعداد ہے اور مطالعۂ کتب پر موقوف نہیں) حاصل تھا۔ اقبال اُسے آتش سینہ، عشق، ذوق نگاہ، تب و تاب، بادۂ ناب وغیرہ الفاظ سے تعبیر کر کے اس کا مدعی ہوتا ہے۔

حلقہ گرد من زنید اے پیکران آب و گل آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما
عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدہ تصوّرات
اے پسر ذوق نگاہ از من بگیر سوختن در لاالہ از من بگیر
از تب و تابم نصیب خود بگیر بعد من ناید چو من مرد فقیر
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب نہ میکدہ میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

یہ عشق یا ذوق نظر اقبال کی اہم ترین اور سب سے زیادہ مایہ ناز استعداد تھی کیونکہ اس کے بغیر مغربی فلسفہ کی واقفیت اُسے فائدہ نہ دے سکتی اور وہ مغربی تصوّرات کا صحیح تجزیہ نہ کر سکتا اور اقبال اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ دنیا کے آخری اور عظیم ترین فلسفہ کا موجد ہے تاہم اپنے آپ کو فلسفی نہیں کہتا۔ بلکہ ایک درویش، مرد فقیر یا قلندر کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کے فلسفہ کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں بلکہ وہ اس کے جذبۂ ایمان کی عقلی توجیہ اور تشریح ہے لیکن دنیا کے اعلیٰ ترین اور عقلی اور منطقی طور پر صحیح ترین فلسفہ کا امتیازی نشان بھی یہی ہے۔

تیسرے اسے شعر کا ملکہ حاصل تھا جس کی بدولت وہ اپنے مطالب کا اظہار نہایت مؤثر طریق سے کر سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ شعر کی وجہ سے اس کا فلسفہ اس کی زندگی میں ایک منظم صورت اختیار نہ کر سکا لیکن اگر اقبال اپنے خیالات شعر میں بیان نہ کر سکتا تو اس کی

تعلیم اس سرعت کے ساتھ دلوں پر اثر انداز نہ ہوتی جس کی اس وقت قوم کی خطرناک حالت کے پیشِ نظر ضرورت تھی۔ جس قدر مرض شدید اور گہرا تھا ضروری تھا کہ اس کا علاج بھی اسی قدر طاقتور اور سریع الاثر ہوتا۔ پس قدرت نے دوا کی تاثیر کو اس کے بدرقہ یعنی شعر کے ساتھ اور تیز کر دیا۔ اقبال خود کہتا ہے:

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقہ بے زمام را

اقبال نے اسلام کے نئے ظاہر ہونے والے فلسفہ کو گایا اور شعر کے اثر سے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو فی الفور جمع کر دیا۔ اگرچہ ابھی طلسم فرنگ پوری طرح سے نہیں ٹوٹا اور ہمیں نہ اپنی منزل اور نہ اپنی راہ صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ہم کسی منزل کی طرف چل نکلنے کے لیے اکٹھے ضرور ہو گئے ہیں۔ قریب ہے کہ ہم راہ کو بھی ڈھونڈ نکالیں اور منزل کا نشان پا کر اس کی طرف چل نکلیں۔ اب جب کہ ہماری موت کا قوی خطرہ ٹل گیا ہے، فلسفۂ خودی زیادہ منظم اور زیادہ واضح صورت میں سامنے آئے گا۔

اقبال کا اثر

اسلام کا وہ قدرتی ردِّ عمل جس کا آغاز اقبال کی ذات میں ہوا تھا جب تک اپنے کمال ضروری ہے کہ یہ ردِّ عمل اپنے مقصد کو پالے کو نہ پہنچے اور اپنے مقصد کو نہ پالے رُک نہیں سکتا۔ بلکہ اب اقبال کے ایسے شارحین کو اپنا آلۂ کار بنائے گا جن پر وہی قلبی واردات نازل ہوں گی جو اقبال پر نازل ہوئی تھیں اور مواثر بڑھتا اور زور پکڑتا رہے گا۔ تا آنکہ مغرب کے بیہودہ فلسفیانہ تصورات نہ صرف دنیائے اسلام سے بلکہ صفحۂ عالم سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱:۱۸)

ترجمہ:۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں پس وہ باطل کو کچل ڈالتا ہے تا آنکہ باطل ناگہاں مٹ جاتا ہے۔

اور قدرت نے اقبال ہی کی معرفت اس کے ہمراز شارحین کی آمد کے لیے زمین ہموار کی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر بڑے فلسفی کو اس کے شارحین نے ہی عظمت کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ بات اقبال کی صورت میں بھی پوری ہوگی۔ اقبال کے کئی اشعار ایسے ہیں جن میں وہ بڑے درد اور اشتیاق کے ساتھ اپنے رازدان شارحین کی آمد کا انتظار کرتا ہے۔ یہ رباعی جو اس کے آخری اشعار پر مشتمل ہے، اس کے درد بھرے انتظار کا پتہ دیتی ہے ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال نے اپنے فلسفہ کا مختصر سا خاکہ ساقی نامہ میں دیا ہے۔ لیکن اس کی تشریح اور تفصیل کے نکات اس کی ساری تصانیف میں بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ اگر ہم ان نکات کو ایک عقلی یا منطقی ترتیب کے ساتھ آراستہ کریں اور اس کی ضروری تشریح کرتے ہوئے ان کو ان کے نتائج کی انتہا تک لے جائیں تو فلسفہ خودی ایک مفصّل اور منظم شکل میں آجاتا ہے[1]۔

فلسفۂ خودی کے نقاط

فلسفۂ خودی کیا ہے

فلسفۂ خودی کیا ہے۔ علم جدید کی روشنی میں قرآن کی تفسیر ہے اور قرآن کی روشنی میں علم جدید کی تطہیر۔ ان دونوں حقیقتوں کو جمع کرنے کی وجہ سے وہ ایک ایسے عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ ہے جو ایک طرف سے خالص اسلامی انقلاب ہوگا اور دوسری طرف سے خالص ذہنی intellectual انقلاب۔

میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ ہر فلسفہ کا مرکزی نکتہ فطرتِ انسانی کا تصوّر ہوا کرتا ہے۔

---

[1] فلسفہ خودی کی مکمل و منظم تشریح کے لیے میری کتاب "آئیڈیالوجی آف ذی فیوچر" ملاحظہ فرمایئے۔

جس قدر ہمارا فطرتِ انسانی کا تصور درست ہوگا، اس قدر ہمارا فلسفہ جو ہم اس کے ارد گرد تعمیر کریں گے درست ہوگا اور جس قدر کوئی فلسفہ فطرتِ انسانی کے صحیح تصوّر سے ہٹا ہوا ہوگا، اسی قدر وہ نادرست اور عقلی طور پر غیر مدلل ہوگا۔ فلسفۂ خودی چونکہ فطرتِ انسانی کے صحیح تصوّر پر (جو خالقِ فطرت نے خود تعلیم کیا ہے) مبنی ہے، اس لیے وہ اس قابل ہے کہ عقلی طور پر تمام دوسرے فلسفوں سے زیادہ معقول اور مدلل ہو۔ کارل مارکس، فرائڈ، ایڈلر، میکڈوگل اور دوسرے فلسفیوں کے غلط نظریات کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ انسان کی فطرت کو نہیں سمجھ سکے اور نوعِ بشر کی ساری مصیبتیں بھی اسی وجہ سے ہیں کہ اس کے دانا اور حکیم یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ انسان کی فطرت کیا ہے۔ مغرب کے لوگ بار بار تہذیب، نیکی، انصاف اور آزادی کا نام لیتے ہیں۔ لیکن اُن کا کوئی فلسفہ اُن کو بتا نہیں سکا کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہے۔ اور کیوں کر متعین کیے جا سکتے ہیں۔ ان اقدار کے متعلق مغرب کی ہر قوم کا تصور الگ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم اپنی اپنی نیکی، تہذیب، انصاف اور آزادی کی حفاظت کی خاطر دوسری قوموں کے ساتھ دست بگریباں ہے۔ انسان کے سارے معاملات میں ایک انتشار پیدا ہوا ہے اور نوعِ انسانی ایک شدید قسم کی پریشانی اور بیقراری میں مبتلا ہے۔ تہذیب، تمدّن اور علم کے بڑے بڑے دعووں کے باوجود مغرب کے متفکّرین فطرتِ انسانی کے بارے میں اپنی لاعلمی کو بُری طرح محسوس کر رہے ہیں اور بیقرار ہیں کہ انہیں کوئی بتائے کہ انسان کیا ہے۔ وہ خود کیا ہیں۔

مغربی حکماء کا ذہنی انتشار

ڈاکٹر روگر کی پریشانی

حال ہی میں ڈاکٹر روگر جے ولیمز Dr. Roger I. Williams نے جو امریکہ کا ایک نامور سائنسدان ہے۔ دنیا بھر میں سائنسدانوں کی سب سے بڑی انجمن اے۔ اے۔ اے۔ ایس American Association for Advancement of Science کے ایک اجلاس میں

جس میں پانچ ہزار سے زائد سائنسدان شریک تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا:

"پچھلے ایک سو سال میں سائنس نے علم صنعت میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے اب اُسے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیئے۔ سائنسدان سوسائٹی کے سالمہ یعنی فرد انسانی کے متعلق وہ معلومات حاصل نہیں کر سکے جو انہوں نے مادہ کے سالمہ متعلق بہم پہنچائی ہیں۔ اب ہمیں ساری توجہ اس بات کی دریافت میں صرف کرنا چاہیئے کہ انسان کیا ہے۔ آج ہم اپنی جس کمی کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں وہ اس بات کی لاعلمی ہے کہ لوگ کیا ہیں۔ ہم سچ مچ کے انسان جو اس کرۂ زمین پر بستے ہیں کیا ہیں۔ آج ہماری تہذیب کو سالمہ کے بم سے یا جراثیم کی جنگ سے فنا ہونے کا خطرہ نہیں۔ بلکہ ہم اس کے لیے خود ایک خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اپنی بدبختی کے لیے ایٹم بم کو مجرم ٹھہرائیں تو ہم اس نادان لڑکے کی طرح ہوں گے جو بائیسکل سے گر جانے کے بعد اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے بائیسکل کو جوتے کی ٹھوکر لگاتا ہے۔ اگر ہماری تہذیب مٹ گئی تو وہ آلات یا اسلحہ جو انسان کام میں لائے گا اس کی بربادی کا موجب نہ ہوں گے بلکہ انسان خود ہی اپنی ہلاکت کا موجب ہوگا۔"

میکڈوگل کی فکر

اسی طرح میکڈوگل Mc Dougal. جو دنیا کے مشہور ترین علماء نفسیات میں سے ہے خود فطرت انسانی کے مطالعہ کا ماہر ہونے کے باوجود لکھتا ہے:

"انسان کی فطرت کے متعلق ہماری عدم واقفیت نے آج تک تمام اجتماعی علوم کی نشوونما کو روکا ہوا ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک ایسی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں جس کے لیے دنیا چلا رہی ہے۔ ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ فنا کے شدید خطرہ سے دوچار ہے۔

میرا ادعا یہ ہے کہ اپنی تہذیب کے ترازو کو برابر رکھنے کے لیے ہمیں

انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کے متعلق اس سے بہت زیادہ علم (ایک منظم اور عقلی طور پر مرتب علم) کی ضرورت ہے جو ہمیں اس وقت حاصل ہے۔

پس ہماری تہذیب کی غیر متیقن اور بڑھتی ہوئی خطرناک حالت کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں سرعت کے ساتھ اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم کی شکل دینا چاہیئے اور اس غرض کے لیے پہلے ہمیں انسان کی فطرت اور اس کے اعمال اور افعال کے متعلق ایک منظم واقفیت بہم پہنچانا چاہیئے۔

پس عملی صورت میں اس کا علاج کیا ہے۔ میں اس سوال کے مختصر جواب کے طور پر یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ڈکٹیٹر بن جاؤں تو کیا کروں..... میں ہر ممکن طریق سے اپنی قوم کے ذہین ترین افراد کو مادی علوم سے اٹھا کر انسانی اور اجتماعی علوم کی جستجو پر مقرر کر دوں"۔

اور ایک دو نہیں بلکہ مغرب کے سارے مفکرین فطرتِ انسانی کے متعلق اپنی لاعلمی کو انسان کے سارے مصائب کا موجب ٹھہرا کر اس کا رونا رو رہے ہیں اب یہ عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ فطرتِ انسانی کے متعلق انسان کا علم مدّت سے ایک نقطہ پر جا کر ٹھہر گیا ہے اور آگے نہیں جاتا۔ ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں

فطرتِ انسانی کی لاعلمی کا عام احساس

"اب ہمیں ایک ایسے گیلیلیو Galilio کی ضرورت ہے جو طبیعیات کی طرح علم کے اس شعبہ میں بھی انسان کی ترقی کا دروازہ کھول دے"۔

افسوس کہ میکڈوگل Mc Dougal اور اُس کے بھائی بندوں کو جو اپنی تہذیب کی متوقع فنا کے غم میں گھلے جا رہے ہیں، یہ معلوم نہیں کہ مادی دنیا کے علم کی طرح فطرتِ انسانی کا علم اس کی قوم یا دنیا کی کسی اور قوم کے ذہین ترین انسانوں کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کے لیے قدرت ایک اور قسم کے انسان دنیا میں پیدا کرتی ہے جن کی اہمیت کا اندازہ ابھی اس کو اور اس کی قوم کو نہیں ہوا۔ اور وہ انسان خدا کے پیمبر ہیں جن سے خالق

فطرت انسان کا علم اور انبیاء علیہم السلام

فطرت خود ہمکلام ہوتا ہے اور جو اُس سے براہِ راست انسان کی فطرت کا علم حاصل کرتے ہیں۔ پھر جس سے مادی علوم میں ایک علمی مسئلہ کا آخری اور مستقل حل کرنے کے لیے ایک آخری عالم یا ذہنی نابغہ Intellectual genius. پیدا ہوتا ہے اسی طرح انسانی اور اجتماعی علوم میں فطرتِ انسانی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے بھی ایک آخری پیغمبر یا روحانی نابغہ spiritual genius. پیدا ہوتا ہے جو اس مسئلہ کو آخری طور پر صاف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہمارے ذہین ترین انسان چاہیں تو اُس کے عطا کیے ہوئے علم کو (جب علم کا ارتقاء اس کی عقلی تفصیلات اور جزئیات کو بے نقاب کرنے کا موقعہ دے) اپنی ذہنی کاوش سے ایک منظم علم یا سائنس کی شکل دے سکتے ہیں۔ میکڈوگل Mc. Dougal. چاہے تو فطرتِ انسانی کا مسئلہ حل کرنے والے

فطرتِ انسانی کا راز

پیغمبر (فداہ امی وابی) سے فطرتِ انسانی کا یہ تنہا راز سیکھ لے تو توحید یعنی خدا پر ایمان لانا اور زندگی کو خدا کی رضاجوئی کے لیے وقف کر دینا صرف ایک نصب العین ہے جس کی جستجو انسان کو مستقل اور مکمل طور پر مطمئن کر سکتی ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۳۰:۳۰)

ترجمہ:۔ تو اے پیغمبر ایک خدا کے ہو کر اس کے دین کی طرف اپنا رُخ کیے رہو۔ یہ خدا کی بنائی فطرت ہے جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی پیدا کی فطرت میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اور یہی ساری کائنات کا راز ہے:

قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۲۵:۶)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ یہ قرآن اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کے راز سے

واقف ہے۔

اور اسی کے اردگرد ایک سچا مضبوط اور مستقبل فلسفۂ زندگی وجود میں آسکتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲:۲۵۶)

ترجمہ:۔ اور جو شخص جھوٹے خداؤں سے انکار کرے اور سچے خدا پر ایمان لائے۔ اس نے گویا ایسی مضبوط رسی کو تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتی۔

خوش قسمتی سے اس بیسویں صدی میں علم کے دونوں شعبوں یعنی علم الانفس اور علم الآفاق میں علم کی ترقی اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں قرآن کا یہ نظریہ آسانی کے ساتھ فطرتِ انسانی کے

علم کی ترقی اور فطرتِ انسانی کا منظم علم

ایک ایسے گوشے "منظم اور عقلی طور پر مرتب علم" کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے جس کی ضرورت میکڈوگل اور اُس جیسے دوسرے لوگ اس زمانہ میں شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور یہ کام فلسفۂ خودی کی صورت میں انجام کو پہنچا ہے۔ شعورِ انسانی سے باہر کی دنیا کو قرآن کی اصطلاح میں آفاق کہا گیا ہے اور شعورِ انسانی کی دنیا کو انفس۔ علم الآفاق میں طبعیات Physics اور علم الحیات شامل ہیں اور علم الانفس علم النفس Psychology پر مشتمل ہے۔

ارتقاء کو تین بڑی منزلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور وہ ہیں مادہ، حیوان اور انسان اور

علم کی تین شاخیں

ان کے مقابل میں علم کی بھی تین ہی بڑی قسمیں ہیں۔ علم طبعیات جو مادہ کے خواص سے تعلق رکھتا ہے۔ علم الحیات جو حیوان کی ماہیت کا مطالعہ کرتا ہے اور علم النفس جو انسان کے شعور سے تعلق رکھتا ہے جس علم کو ہم فلسفہ کہتے ہیں اور جس کا کمال فلسفۂ خودی ہے وہ درحقیقت نفسیات کائنات کا مطالعہ ہے اور علم کی تینوں اقسام اس کی شاخیں ہیں۔

اگر انفس اور آفاق کے تازہ علم کی روشنی میں ہم فطرتِ انسانی کے متعلق قرآن کے نظریہ کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ اس کی تہ میں علم النفس کی وہ قیمتی حقیقت ہے

نصب العین کی کشش فطرتِ انسانی کا قوی ترین جذبہ ہے

ہے جس کے نہ جاننے کے سبب سے تمام فلسفیوں نے اپنے اپنے استدلال میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور غلط اور گمراہ کن فلسفے پیدا کیے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیات کا قوی ترین جذبہ نہ تو روٹی کی کشش Urge for hunger ہے جیسا کہ کارل مارکس کے ذہن میں آیا نہ جنس کی کشش sex urge ہے جیسا کہ فرائڈ نے خیال کیا اور نہ حُبِ استیلاء Urge for power ہے جیسا کہ ایڈلر نے سمجھا ہے اور نہ جبلتوں کا تقاضا (Urge for instinct) ہے جیسا کہ میکڈوگل کو نظر آیا۔ بلکہ وہ نصب العین کی کشش Urge for ideal ہے[1] اور فلسفۂ خودی اس کے تصوّر ثبوت میں ایسے علمی شواہد اور حقائق مہیا کرتا ہے جن کی روشنی میں اس کے مقابل کے تمام تصوّرات جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے غلط نظر آتے ہیں اور جن کی وجہ سے کسی دیانت دار شخص کو اس تصوّر کے تسلیم کر لینے میں دقت نہیں ہوتی۔

اسلام کی راہنمائی

اگرچہ یہ تصوّر آج تک عصرِ جدید کے ماہرین نفسیات کی نظروں سے اوجھل رہا ہے لیکن اس کی نوعیت ایسی ہے کہ ایک دفعہ آشکار ہونے کے بعد یہ ایک پیش پا افتادہ، آسان اور سادہ حقیقت نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ تصوّر فطرتِ انسانی کے اسرار میں سے تھا اس لیے سادہ اور آسان ہونے کے باوجود اس کا مناسب وقت پر آشکار کرنا صرف اس قوم کے لیے ممکن تھا اور اُسی قوم کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا جس کو خاتم الانبیاء کی معرفت فطرت انسان کی صحیح تعلیم دی گئی تھی۔

یہ تصوّر اگرچہ معمولی سی حقیقت نظر آتا ہے لیکن اس کے نتائج نہایت اہم ہیں کیونکہ

---

[1] قرآن مجید کی آیت اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہمیں اس تصوّر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

نظمِ علوم کا رشتہ دنیائے علم میں اس کے داخل ہونے سے سارے علم کا رُخ بدل جاتا ہے اور تمام علمی حقائق کے اندر ایک اطمینان بخش ترتیب اور دلکش انتظام پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس تصوّر کے تسلیم کرنے کے بعد ہم علم کی ایک ایسی توجیہہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور علم کی ایک ایسی شاہراہ پر چل نکلتے ہیں جو ہمیں بالآخر کائنات کے سربستہ رموز تک پہنچا دیتی ہے۔ فلسفۂ تاریخ معاشیات، علم النفس، فلسفۂ اجتماع، فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تعلیم اور سارے انسانی اجتماعی علوم میں جس قدر انتشار اس وقت موجود ہے اور فطرتِ انسانی کے متعلق

انسانی مسائل کا حل دورِ حاضر کی جس قدر لاعلمی ہے وہ اپنے تمام ہلاکت خیز نتائج کے ساتھ صرف اس تصوّر کی لاعلمی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس تصور کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی اب تک انسان کے لیے ممکن نہیں ہوا کہ وہ انصاف، نیکی، آزادی، سچائی، اخوت، مساوات کی مانند اصطلاحات کی کوئی ایسی واضح اور معین تعریف کر سکے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔ یا رنگ، نسل، قوم، ذات پات اور طبقات کے جھگڑوں کا کوئی علمی حل پیدا کر سکے یا افراد اور اقوام کو اخلاقی اصولوں کی پابندی پر آمادہ کر کے خونریزی کا انسداد کر سکے۔ یا امن و اتحادِ عالم کی تعمیر کے لیے صحیح خطوط پر کوئی ایسا کام کر سکے جو دن بدن اُسے کامیابی کے قریب تر لاتا جائے۔

ایک جدید فلسفہ کا مرکزی تصوّر جونہی ہم اس تصوّر کو کہ انسان کی تمام خواہشات کشش نصب العین کے ماتحت کام کرتی ہیں ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیں (اور اس کے سوائے ہمارا کوئی چارہ بھی نہیں) تو ہمیں فی الفور بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اپنا جواب چاہتے ہیں۔ کشش نصب العینی کا سبب کیا ہے؟ یہ ارتقاء کے کس مقصد کو پورا کرتی ہے؟ اس کے مکمل اطمینان کا طریقہ کیا ہے؟ اگر یہ مکمل طور پر مطمئن نہ ہو سکے تو اس سے کیا کیا عملی اور نفسیاتی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ نصب العینوں کے اختلافات کا سبب کیا ہے؟ نصب العین کے نفسیاتی عناصر کیا ہوتے ہیں، یعنی نصب العین میں کون سے ایسے

اوصاف ہوتے ہیں جو ہمیں کشمکش کرتے ہیں۔ بعض وقت ہم ایک نصب العین کو ترک کر کے دوسرے نصب العین کو کیوں اختیار کرتے ہیں۔ فرد اور جماعت کی زندگی میں نصب العین کی تبدیلی کس سمت میں ہوتی ہے اور کیوں؟ جب ہم اس تصور کو ذہن میں رکھ کر ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں۔ تو ہمیں نظر آتا ہے کہ تازہ ترین علمی حقائق ہماری تائید کے لیے دوڑتے ہیں اور ہمیں ان سوالات کا ایک ایسا جواب مہیا کرتے ہیں جو کائنات کے ایک منظم فلسفہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اساسیاتِ اسلام کا فلسفہ

اور پھر یہ فلسفہ نہ صرف ایک طرف محض فلسفہ کی حیثیت سے تمام دوسرے فلسفوں سے زیادہ معقول اور مدلل ثابت ہوتا ہے بلکہ دوسری طرف اسلام کے بنیادی اصولوں یعنی توحید، نبوت، ختم نبوت، شریعت، جہاد، حریت، اخلاق، عمل، سزا اور جزا وغیرہ کی پوری پوری تائید کرتا ہے۔ یعنی اس فلسفہ کی وجہ سے یہ اصول کسی تکلیف اور بناوٹ کے بغیر کائنات کے عقلی نظام کا ایک جزو نظر آتے ہیں اور یہ بات اسلام کی صداقت کا ایک اور بیّن ثبوت ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہوا ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک صحیح علمی تصور کی بنا پر ہماری خالص علمی جستجو ایسے نتائج پیدا کرتی جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی تائید و توثیق کرتے۔ اس فلسفہ کا بنیادی تصور فانے کی لوک کی طرح ہے کیونکہ اس کے تسلیم کرنے کے بعد باقی تمام اسلامی تصورات کے قبول کرنے کے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

یہ فلسفہ ضمناً حکماء کے دیرینہ اختلافات کو سلجھاتا اور انفرادی اور اجتماعی نفسیات، فلسفہ لاشعور، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تاریخ، فلسفہ سیاست اور فلسفہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے بہت سے ایسے مشکل مسائل کا حل کرتا ہے جو اب تک حکماء کے لیے ایک معمّہ بنے ہوئے تھے۔ پھر ان سوالات کے جواب کے ضمن میں یہ فلسفہ ہمیں دوسرے تمام فلسفوں سے زیادہ معقول اور قابل فہم طریق سے بتاتا ہے کہ حُسن، کمال، جبلت، عمل، علم، سیاست، مذہب، فلسفہ، ہنر، اخلاق، قانون اور تعلیم کیا چیزیں ہیں۔ ریاست کیا چیز ہے۔ کیونکر وجود

میں آتی ہے۔ اس کی ترقی اور تنزل، عروج اور انحطاط کے اسباب کیا ہیں۔ کیونکر رو کے یا پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ مذہبی ریاست کی اصطلاح کیونکر بے معنی ہے۔ وجدان کی کیا حیثیت ہے۔ عقل کا دائرۂ عمل کیا ہے۔ قوموں میں جنگیں کیوں ہوتی ہیں۔ اُن کا مستقل علاج کیا ہے۔ نبوت کیا چیز ہے۔ ارتقاء کے لیے کیوں ضروری ہے ختم کیوں ہو جاتی ہے قومیں اور افراد خواہش کے باوجود اخلاقی اصولوں کی پابندی کیوں نہیں کر سکتیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

ان سوالات میں سے بعض کے مقابل میں ہم نے وہ جوابات بھی سنے ہیں جو اسلام کی طرف سے ہمارے علماء اب تک دیتے رہے ہیں لیکن فلسفۂ خودی کے جوابات کچھ اور قسم کے ہیں۔ ایک تو یہ اسلام کی سچی روح سے سرزد ہوتے ہیں اور ان میں غلط تصوّرات سے کوئی مدد نہیں لی گئی۔ اور دوسرے ان کا مقصد ہماری کامیاب یا ناکام تسلی کرنا نہیں بلکہ غلط تصوّرات کو جڑ سے اُکھیڑ کر ان کی جگہ صحیح تصوّرات کو قائم کرنا ہے۔

اسلام کا اصلی جواب

اصل بات یہ ہے کہ دورِ حاضر کے غلط فلسفیانہ تصوّرات کے مقابل میں اسلام اس وقت تک خاموش رہا ہے جب تک کہ اس نے فلسفۂ خودی کی صورت میں اپنی زبان کو نہیں کھولا۔

ایک علمی حقیقت

فلسفۂ خودی کا مرکزی تصوّر کہ نصب العین کی کشش انسان کی زندگی، مدار و محور ہے، ایک علمی حقیقت کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام علمی حقائق کے اندر ایک تسلی بخش ترتیب اور نظام پیدا کرتا ہے اور اس کی جگہ لینے والا کوئی اور تصوّر ان کے اندر یہ ترتیب اور نظام پیدا نہیں کرتا۔ تمام علمی حقائق جو انسان آج تک دریافت کر سکا ہے، اس تصوّر کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور اس کے مقابل کے کسی اور تصوّر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ علمی حقائق دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک علمی حقیقت تو وہ ہے جسے ہم تجربہ اور مشاہدہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم معمل میں تجربہ کر کے دیکھ لیتے ہیں کہ پانی کی ترکیب میں آکسیجن Oxygen اور ہائیڈروجن، Hydrogen ایک اور دو کی نسبت کے ساتھ شامل ہیں اور دوسری علمی حقیقت

وہ ہے جو ایک مفروضہ کی شکل میں ہوتی ہے۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ سے معلوم کیے ہوئے حقائق کے ایک غیر منظم اور ناقابل فہم مجموعہ کے اندر داخل ہو کر ایک قابل فہم ترتیب اور نظام پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً سالمہ Atom کے متعلق ہمارا نظریہ اسی قسم کی ایک علمی حقیقت ہے لیکن یہ حقیقت خیالی یا فرضی ہونے کے باوجود کس قدر سچی ہے۔ دنیا نے ہیروشیما کی ہولناک تباہی میں اس کا عینی مشاہدہ کر لیا ہے۔ فلسفۂ خودی کا مرکزی تصور اسی دوسری قسم کی ایک علمی حقیقت ہے۔

اتحادِ علوم

گویا یہ تصور سارے علوم کو متحدہ کرتا ہے اور اس کی بنا پر اہم علوم کی ایسی تشریح کر سکتے ہیں کہ وہ سب کے سب کائنات کے ایک مرکزی مدعا کے معاون نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فلسفۂ خودی ایک ایسی مکمل اور مسلسل وحدت ہے جس کا ہر ایک تصور دوسرے تمام تصورات سے تائید اور قوت حاصل کرتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ کہنا نہ تو کوئی مبالغہ ہے اور نہ خوش فہمی کہ فلسفۂ خودی اس دور کے تمام نظریاتِ عالم سے زیادہ معقول ہے۔

باطل نظریات کی شکست

چونکہ فلسفۂ خودی کا مرکزی تصور ایک سادہ اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر اس کی مناسب نشر و اشاعت دنیا میں ہو تو یہ کارل مارکس کے نظریے سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ دنیا میں پھیلے گا اور پھر جوں جوں یہ تصور دنیا کے تعلیم یافتہ طبقہ کی سمجھ میں آتا جائے گا باطل نظریات کی بنیادیں اکھڑتی جائیں گی۔ کیونکہ باطل نظریات سب کے سب اسی تصور کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا اور زندہ ہیں۔ اشتراکیوں نے اپنے اس نعرہ سے کہ روٹی یا اقتصادی ضروریات کی کشش انسان کے تمام اعمال کی جڑ ہے نصف دنیا کو فتح کر لیا ہے لیکن ہم اپنے اس نعرہ سے کہ نصب العین کی کشش انسان کے تمام اعمال کی جڑ ہے، اس فتح کو آسانی کے ساتھ شکست میں بدل سکتے ہیں۔ کیونکہ اس حقیقت کے تسلیم کر لینے کے بعد دنیا ہماری یہ بات بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گی کہ اقتصادی ضروریات کا مسئلہ اور انسان کی زندگی کے باقی تمام مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک ہم اپنے

نصب العین کو درست کر کے نصب العین کی فطرتی کشش کو پوری طرح سے اور صحیح طریق سے مطمئن کرنے کا انتظام نہ کریں۔

اشتراکیوں کا نام نہاد مقصد "ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق سے لے کر ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق تک" From everyone according to his work; to everyone according to his needs. اسلامی اور اشتراکی ریاست کا فرق

ایک اشتراکی ریاست میں نہیں بلکہ صرف ایک اسلامی ریاست میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کیونکہ اس کی تکمیل کے لیے نفسیاتِ انسانی کے بعض ایسے رجحانات اور بعض ایسی خواہشات کو قابو میں لانے کی ضرورت ہے جنہیں قابو میں لانے کے لیے اشتراکیت کے پاس کوئی سامان موجود نہیں۔ لیکن اسلام کے پاس سارا سامان موجود ہے۔ اشتراکیت فرد پر دباؤ ڈال کر اور سختی کر کے بھی اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن ہم دباؤ ڈالنے یا سختی کرنے کے بغیر بھی اس کو پوری طرح حاصل کر سکتے ہیں اور پھر اسلامی نظامِ حکومت میں اگر فرد پر بھی کوئی سختی روا رکھی جائے تو وہ اس کی آزادی کو سلب نہیں کرتی اور نہ اس کی فطرت کو دباتی یا روکتی ہے بلکہ اُسے اور آزاد کرتی ہے اور مزید اُبھرنے کا موقع دیتی ہے۔ پس اگر دنیا غلامی کے ساتھ ناکام معاشی اعتدال چاہتی ہے تو اشتراکیت کو پسند کرے گی اور اگر آزادی کے ساتھ کامیاب معاشی اعتدال چاہتی ہے تو اسلام کو ترجیح دے گی۔

فلسفۂ خودی اشتراکیت کا ایک ہی جواب ہے

فلسفۂ خودی واضح طور پر بتاتا ہے کہ اشتراکیت کا سیلاب کہاں رُکے گا اور کیونکر لوٹایا جائے گا۔ یوں تو ہم ہمیشہ سے کہتے رہے ہیں کہ اسلام اشتراکیت کا جواب ہے۔ لیکن فلسفۂ خودی وجود میں آنے سے پہلے ہمارے لیے مشکل

لہ اشتراکیت کی زیادہ مفصل تردید کے لیے میری کتاب "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" کی فصل مارکسزم Marxism. ملاحظہ فرمایئے۔

تھا کہ ہم دنیا کو وضاحت سے بتا سکیں یا قائل کر سکیں کہ ایسا کیوں ہے۔ پچھلے سال امریکہ کی حکومت نے اشتراکیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک پانچ کا پروگرام شائع کیا تھا جس کا اوّلین یہ تھا کہ ایسا لٹریچر پیدا کیا جائے جو اشتراکیت کا جواب ہو۔ لیکن اشتراکیت جیسے ایک مکمل نظریہ کائنات کی تردید کے لیے ایک اور مکمل نظریۂ کائنات کی ضرورت ہے جو اس سے زیادہ معقول اور قابلِ قبول ہو اور جس میں اشتراکیت کے نقائص خود بخود عیاں ہو جائیں۔ اشتراکیت کے مقابلہ کے لیے اس قسم کا نظریۂ کائنات عیسائی دنیا ایک صدی کی اتھاہ کوششوں کے باوجود آج تک پیدا نہیں کر سکی۔ اور نہ اس میں صلاحیت ہے کہ آئندہ پیدا کر سکے۔ اس فلسفہ کی کلید فقط مسلمان قوم کے ہاتھ میں دی گئی ہے خواہ دنیا فلسفہ کے میدان میں اسلام کی قیادت کو پسند کرے یا نہ کرے لیکن اس قسم کا فلسفہ دنیا کو اسلام سے ہی لینا پڑے گا اور وہ فلسفہ فلسفۂ خودی ہے۔

تازہ علمی حقائق کی تائید

یہ بات اس زمانہ میں فلسفۂ خودی کو نمودار کرنے کے لیے قدرت کے خاص اہتمام کا ثبوت ہے کہ فلسفۂ خودی کا مرکزی تصوّر ایک ایسے وقت میں آشکار ہوا ہے جب علم کی ہر سطح پر بہت سے ایسے حقائق منکشف ہوئے ہیں جو اس تصوّر کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں اور اس کے مقابل کے کسی دوسرے تصوّر کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ ان حقائق کے بغیر فلسفۂ خودی وجود میں نہ آسکتا کیونکہ ان کے بغیر نہ تو اس کے مرکزی تصور کو ہی کافی سہارا ملتا اور نہ ہی ہم ان سوالات کا تسلی بخش جواب دیا کر سکتے جو یہ تصور پیدا کرتا ہے۔

آئندہ کے علمی حقائق کا خط

پھر چونکہ اب تک کے تمام حقائق فلسفۂ خودی کی تائید کرتے ہیں، ہم توقع کر سکتے ہیں کہ آئندہ کے علمی حقائق بھی فلسفۂ خودی پر مزید روشنی ڈالیں گے اور اس کی مزید تفصیلات اور جزئیات بہم پہنچائیں گے۔ گویا فلسفۂ خودی ہمیں موقع دیتا ہے کہ ہم آئندہ کے علمی انکشافات کی ممکن نوعیت کا کچھ اندازہ قائم کر سکیں اور لہٰذا ایک حد تک

آئندہ کی علمی جستجو کے لیے معاون ہے۔ اسی طرح سے یہ فلسفہ اسلامی علمی تحقیق کی راہیں معین کرتا ہے۔

اسلامک ریسرچ کے معنی ان دنوں ہماری یونیورسٹیاں اسلامک ریسرچ Islamic Research. کی طرف خاص توجہ دینا چاہتی ہیں۔ لیکن اس کے لیے ان کو موزوں اشخاص میسر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علمی انحطاط کے اس دور میں ہم میں ایسے اشخاص بہت کم ہیں جو ٹھیک طرح سے جانتے ہیں کہ اسلامک ریسرچ کس طریق سے ہو اور کس سمت میں ہو۔ لے دے کے اسلامک ریسرچ فقط اس بات کا نام رہ گیا ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی پرانی کتابوں میں سے کوئی ایسی علمی حقیقت نکال کر دنیا کو دکھا دیں جو اس زمانہ کے محققین نے بھی دریافت کی ہو اور دنیا کے سامنے زیادہ صحیح اور زیادہ واضح طور پر پیش کی ہو۔ اس قسم کی علمی تحقیقات سے نہ ہمیں کچھ فائدہ ہے اور نہ دنیا کو۔ البتہ ایسی تحقیقات کے نتائج کو ٹیکسلا سے کھودی ہوئی چیزوں کے ساتھ کسی عجائب خانہ میں رکھا جا سکتا ہے تاکہ انسان کے ماضی کے متعلق لوگوں کا ذوق دریافت مطمئن ہوتا رہے۔ ہمارا ماضی بہت شاندار ہے لیکن ہمارا مستقبل اس سے کئی گنا زیادہ شاندار ہونے والا ہے اور ہمیں چاہیئے کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے کام کریں۔ اسلامک ریسرچ سے مراد ایسی علمی جستجو ہے جس سے ہم علمی صداقتوں کو کچھ موجودہ علوم سے الگ کر کے اور کچھ تازہ ذہنی کاوش سے پیدا کر کے اپنے نظام تصورات کی لڑی میں پروتے چلے جائیں۔ اس قسم کی علمی جستجو کا نتیجہ نہ صرف اسلام کا علمی ارتقاء ہے بلکہ نوع انسانی کا مجموعی علمی ارتقاء بھی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اب جبکہ فلسفہ نحوی یعنی کانٹ کا پہلا اور آخری صحیح فلسفہ وجود میں آچکا ہے۔ اسلامک ریسرچ بلکہ انسانی اور اجتماعی علوم کا سارا ریسرچ اسی فلسفہ کے اندر اس کی مدد سے اور اس کی راہ سے ہو سکتا ہے۔ اس فلسفہ کی راہنمائی کے بغیر ہم اپنی علمی تحقیقات میں (خواہ اسے اسلامک ریسرچ کا نام دیا جائے یا انسانی یا اجتماعی علوم کے عام ریسرچ کا) کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ علمی تحقیقات کی کامیابی اس بات کا نام ہے کہ ہم علم کو اس نقطہ سے اور آگے

لے جائیں جہاں وہ پہنچ چکا ہے۔ فلسفۂ خودی نہ صرف ہماری آج تک کی علمی جستجو کے تمام نتائج کا جائزہ لے کر ان کے صحیح اور کارآمد حصہ کو ایک مناسب ترتیب اور تنظیم کے ساتھ اکٹھا کرتا ہے بلکہ اس کی ترتیب اور تنظیم کی بدولت مزید علمی حقائق کو روشنی میں لاتا ہے لہٰذا اب وہی علمی جستجو کامیاب سمجھی جائے گی جو ان حقائق پر مزید روشنی ڈالے یا ہمیں ان سے اور آگے لے جائے۔

ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ فلسفہ ایک گمراہی ہے کیونکہ اس کا دارومدار عقل پر ہے

ایک اعتراض

اور انسان کی راہنما عقل نہیں بلکہ وحی ہے۔ عقل ہر چیز کو صحیح ثابت کر لیتی ہے۔ اس لیے وہ گویا کسی چیز کو صحیح ثابت نہیں کر سکتی۔

لیکن عقل اور وحی کے مقام کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ

صحیح عقلی استدلال ایک صحیح تصوّر کے اندر بالقوہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن ایک غلط تصور کے اندر موجود نہیں ہوتا

قرآن خود اس بات کا مدعی ہے کہ وہ ایک فلسفہ ہے وہ اپنی طرف "حکمت" کو منسوب کرتا ہے اور لفظ "حکیم" سے اپنے آپ کو تعبیر کرتا ہے "یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ" اور پھر قرآن میں بار بار عقل سے کام لینے کی ہدایت ہے فلسفہ کا لازمی عنصر یا اس کی روح یا بنیاد استدلال نہیں بلکہ کائنات کا ایک وجدانی تصوّر ہے چونکہ قرآن اس قسم کا تصور پیش کرتا ہے لہٰذا وہ فلسفہ ہے۔ جب ایک وجدانی طور پر معلوم کی گئی حقیقت سچی ہو تو ایک مکمل اور بے خطا عقلی اور منطقی استدلال اس کے اندر بالقوہ موجود ہوتا ہے۔ اگرچہ ہم کسی وجہ سے اس استدلال کی جزئیات اس کے اندر سے باہر نہ لائیں یا نہ لا سکیں لیکن اگر وہ غلط ہو اور ہم اسے ایک حقیقت سمجھ رہے ہوں تو اس کے حق میں ہمارا استدلال خواہ کس قدر عمیق اور دقیق ہو، عقل کی ٹھوکروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ درحقیقت ایسا تصوّر بے خطا عقلی یا منطقی استدلال کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ فلسفہ اور عقلی پر جو اعتراضات ہم آج تک کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اُن کا اطلاق فلسفۂ خودی پر نہیں ہوتا کیونکہ یہ سچّا فلسفہ ہے اور سچّی عقل کا نتیجہ ہے۔ فلسفۂ خودی کے وجود میں آنے

سے پہلے انسان کی عقل فلسفہ کے ذریعہ سے اور آسمانی ہدایت سے الگ ہو کر ان ازلی اور ابدی صداقتوں کی پانے کی کوشش کر رہی تھی جو صرف خدا کی وحی آشکار کر سکتی ہے اور لہٰذا ناکام و نامراد تھی۔ اس زمانہ میں فی الواقع فلسفہ اور نبوت کے الفاظ بالترتیب ضلالت اور ہدایت کے ہم معنی تھے لیکن فلسفۂ خودی نے فلسفہ اور مذہب کی تفریق ختم کر دی ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جو خدا کی وحی سے ہدایت پاتا ہے اور ان حقائق پر مبنی ہے جو خدا کی وحی نے آشکار کیے ہیں لہٰذا یہ بیک وقت ایک سچا مذہب اور ایک سچا فلسفہ ہے۔

ہم مسلمان جو خداوند تعالیٰ کو اس کے تمام اسماء اور صفات کے ساتھ (کَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ) مانتے ہیں، تمام قوموں سے بڑھ کر یہ ماننے کے اہل ہیں کہ کائنات کا

کائنات کا سچا فلسفہ

ایک سچا فلسفہ بھی ضرور ہے کیونکہ حکمت یا دانائی خالق کائنات کی ایک صفت ہے۔ اس صفت کی وجہ سے کائنات کے اندر ایک عقلی ترتیب کا ہونا ضروری ہے۔ کائنات کیا ہے؟ خدا کی صفات کا مظہر ہے۔ خدا چاہتا تو کائنات کو آنِ واحد میں سلسلۂ اسباب کے بغیر پیدا کر دیتا، لیکن اس صورت میں اس کی صفتِ حکمت کا اظہار نہ ہو سکتا۔ لہٰذا اس نے کائنات کی تخلیق میں ایک عاقلانہ ترتیب، تدریج اور نظام کو داخل کیا۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ یعنی جس کام کو کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اسباب کا ایک سلسلہ مہیا کرتا ہے۔ ایک سبب دوسرے کو پیدا کرتا ہے اور دوسرا سبب تیسرے سبب کو یہاں تک کہ آخر کار جس چیز کی تخلیق منظور ہوتی ہے، وہ بھی ایک سبب بنے ظہور پاتی ہے۔

کائنات ایک عقلی نظام ہے

کائنات گویا ایک زنجیر کی طرح ہے جس کا ہر ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لیے ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف اور ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔ اسی بات نے ہماری جستجوئے حق و صداقت کو خواہ وہ علم کے میدان میں ہو یا عمل کے میدان میں، ممکن بنایا ہے۔ اسی بنا پر اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں ہماری جزا اور سزا کا انحصار ہے۔ اسی پر نیکی اور بدی، ہدایت

ہیں کہ کوئی فلسفہ عقل پر مبنی نہیں۔ ہر فلسفہ وجدان پر مبنی ہوتا ہے۔ عقل اگرچہ ہمارے وجدان کو اکساتی ہے لیکن خود آزاد نہیں بلکہ ہمارے وجدان یا احساس کی خدمت گزار اور پابند ہوتی ہے۔

ہر فلسفہ کی ابتدا وجدان سے ہوتی ہے اور ہر فلسفی اپنے وجدان کی عقلی تشریح اور توجیہ کرتا ہے۔ فلسفی کی عقل اس کے وجدان کے دائرہ سے باہر نہیں جاتی۔

ہر فلسفہ کی بنیاد وجدان ہے عقل نہیں

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رُو برو

وجدان ایک قسم کا قلبی مشاہدہ ہے اور اس کے مدارج ہوتے ہیں۔ جس قدر ہمارا وجدان ناقص ہو گا اسی قدر ہماری عقل جو اس کی ترجمانی پر مامور ہو گی ناقص ہو گی۔ کامل اور سچا وجدان اس قابل ہوتا ہے کہ وہ زود یا بدیر ایک ایسے عقلی نظام یا فلسفہ کی صورت اختیار کرے جو بے خطا ہو لیکن ایک ناقص اور غلط وجدان اس قابل نہیں ہوتا جو فلسفہ غلط وجدان سے پیدا ہو گا، وہ عقلی طور پر غلط اور ناقص ہو گا۔

ہم اپنی ذہنی کاوش سے اسے ایک صحیح عقلی نظام یا فلسفہ کی شکل نہیں دے سکتے۔ زود یا بدیر اس کی منطقی یا عقلی خامیاں ظاہر ہو جائیں گی۔

عقلی استدلال کی ضرورت

ہر وجدان کی عقل الگ ہے اور ہر عقل اسی وجدان کی طرف راہنمائی کرتی ہے جس کی وہ مخلوق یا پیداوار ہوتی ہے۔ چونکہ فلسفہ بخودی نبوت کے سچے اور صحیح وجدان کی عقلی اور منطقی تشریح اور تفسیر ہے اس لیے وہ عقلی اور منطقی طور پر صحیح ہے اور گمراہ نہیں کرتا بلکہ نبوت کے سچے اور صحیح وجدان کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ صحیح ترین وجدان ایک پیغمبر کا وجدان ہے۔

سچے وجدان سے جو عقل پیدا ہوتی ہے وہ اعلیٰ ترین بلند ترین اور صحیح ترین عقل ہونے کی وجہ سے ایک بیش بہا نعمت ہے۔ اسی عقل کو قرآن حکیم نے حکمت اور خیرِ کثیر کہا ہے۔

حکمتِ قرآنی

اور ضلالت کا امتیاز مبنی ہے۔ اگر کائنات کے اندر کوئی عقلی ترتیب نہ ہوتی تو سائنس کا علم اور دوسرے تمام علوم ممکن نہ ہوتے بلکہ خدا کے پیغمبروں کا ظہور بے معنی ہوتا۔ ایک خدا پرست انسان جانتا ہے کہ کائنات کا ایک نظام ہے جس کی رو سے اُسے اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا ملے گی۔ لہٰذا وہ نیکی کی زندگی اختیار کر کے خدا کے عذاب سے پناہ مانگتا ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳:۱۹۱)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! تو نے اس کائنات کو بے فائدہ نہیں بنایا۔ تو (ایسے فعل عبث کے کرنے سے) پاک ہے۔ پس (جب نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ہے) تو ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

ایک فلسفی ایک سائنسدان یا ایک عالم یا ایک معمولی انسان کو بھی وجدانی طور پر معلوم ہے کہ دنیا ایک ترتیب رکھتی ہے جو عقل سے سمجھی جا سکتی ہے لہٰذا وہ اسباب کی زنجیر کو ٹٹولتا ہوا آگے نکل جاتا ہے اور نئے نئے معلومات اور فوائد جو بالآخر اس کی عملی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں حاصل کرتا جاتا ہے۔ کائنات کا عقلی نظام تخلیق کی ہر سطح پر صاف نظر آتا ہے۔ مادی دنیا میں اس نظام کے ترجمان علم طبیعیات اور کیمیا ہیں۔

حیوانات کی دنیا کے عقلی نظام نے علم الحیات کو ممکن بنایا ہے اور انسانی سطح پر جو عقلی نظام قائم ہے اسے علم النفس کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کی ساری جستجو تلاش اسباب ہی کا نام ہے اور اس جستجو کا سبب یہی ہے کہ کائنات کے اندر ایک عقلی ترتیب موجود ہے۔ فلسفہ کی کوشش یہ ہے کہ اس ترتیب یا نظام کو مکمل طور پر دریافت کیا جائے۔

صحیح عقل اور غلط عقلی کا فرق

لیکن فلسفی ایک سچے اور صحیح وجدان Intuition کے بغیر جو صرف ایک پیغمبر کا حصہ ہے، اُسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح وجدان کے بغیر وہ ایک غلط وجدان سے ابتدا کرے گا اور جو عقل غلط وجدان سے پیدا ہوتی ہے وہ غلط کام کرتی ہے اور غلط ہوتی ہے۔ ہم اس حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیتے

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (۲:۲۶۹)

ترجمہ:۔ جسے چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس شخص کو حکمت دی گئی اسے ایک بہت بڑی بھلائی دی گئی۔

یہی وہ عقل ہے جو ایک امتی کو پیغمبر کے وجدان کی طرف راہنمائی کر کے نورِ ایمان سے بہرہ ور کرتی ہے۔ لہٰذا دین کی تبلیغ میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (۱۶:۱۲۵)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر لوگوں کو عقل کی باتوں اور اچھی نصیحتوں سے اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف بلاؤ۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲:۲)

ترجمہ:۔ وہ ان کو کتاب اور دانائی کی باتیں سکھاتا ہے۔

ہر حکمت کی بات کا ذکر لفظاً قرآن میں نہیں لیکن چونکہ ہر حکمت کی بات معناً قرآن میں ہے اس لیے اوپر کی آیت میں کتاب اور حکمت دونوں کا اکٹھا ذکر کر کے حکمت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ حکمت کی جزئیات کا علم ایک مومن کے ساتھ خاص تھا۔ لیکن ایک مومن قرآن کے علم کی روشنی سے ہر حکمت کو پہچانتا اور قبول کرتا ہے

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فھو احق بھا

ترجمہ:۔ دانائی کی بات مومن کی گمشدہ چیز ہے۔ جہاں پائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے

فلسفۂ خودی حکمتِ قرآنی ہے

قرآنی حکمت یا قرآنی عقل قرآن کے مفہوم کو واضح اور معین کرتی ہے اور اسے ذہنوں کے قریب لاتی ہے۔ یہ ہر زمانہ میں گمراہی کی نوعیت کے مطابق مناسب صورت اختیار کرتی رہی ہے۔ علم کے ارتقاء سے حکمت قرآنی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا ہے۔ فلسفۂ خودی اس دور میں ظہور پانے والی حکمت قرآنی ہے جس نے اس

نمانہ میں علم کی ترقی کی وجہ سے اور زمانہ کی ضرورت کی بنا پر ایک منظم فلسفۂ کائنات کی صورت اختیار کی ہے۔ نبوّت ایک خاتم النبیین کی ذات میں اپنے کمال کو پہنچ کر نظامِ عالم کے اُن حقائق یا زنجیرِ کائنات کی اُن کڑیوں کو آشکار کرتی ہے جن کا علم انسان کی کامیاب زندگی کے لیے ازبس ضروری ہوتا ہے۔

دعوتِ نبوت کی بنیاد استدلال پر نہیں

لیکن یہ حقائق ایک نظامِ عقلی Intellectual system. کی شکل میں نہیں ہوتے حقائقِ عالم کی سلسلہ وار اور مکمل ترتیب مہیا کرنا نبوت کا کام نہیں۔ ایک نبی جن حقائق کی اطلاع دیتا ہے، اگرچہ عقلی استدلال سے آخر کار ان کی پوری پوری حمایت ہو سکتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہی حقائق ہوتے ہیں جو آخر کار عقلی طور پر صحیح ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن نبی نہ تو خود انہیں ایک مکمل عقلی استدلال سے معلوم کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے ذہن میں ایک مکمل عقلی استدلال سے بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ ان حقائق کا براہِ راست مشاہدہ کرتا ہے اور جس طرح سے اور جن الفاظ میں ان کو پاتا ہے بیان کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جن کی صداقت کی گواہی دینے کے لیے انسان کی فطرت پہلے سے ہی آمادہ کی گئی ہے لہٰذہ وہ انسان کی فطرت کو متاثر Appeal کر کے اس کے صحیح فطرتی وجدان کو بیدار کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ خود وہ اپنی تائید میں کوئی عقلی دلائل مہیا کرے یا نہ کرے، اُس کی آواز آخر کار رائیگاں نہیں جائے گی، بلکہ اس کے جواب میں خدا کے بندے اپنے پروردگار کو مخاطب کر کے یہ کہتے ہوئے سنے جائیں گے۔

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا (۳:۱۹۳)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کرنے والے کو سنا کہ ایمان کی منادی کر رہے تھے کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر۔ پس ہم ایمان لے آئے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اگر نبوت کے ختم ہونے کے ساتھ ہی حقائقِ عالم کی ایک مکمل عقلی ترتیب کا علم بھی مہیا ہو جاتا تو غلط فلسفے پیدا نہ ہوتے اور نوعِ انسانی تمام کی تمام خاتم النبیین

کی ہدایت پر فوراً ایمان لے آتی۔ لیکن وہ علم جو انسان رفتہ رفتہ صدیوں کی علمی جستجو اور ذہنی کاوش سے پیدا کرنے والا تھا، اسے فوراً دے دینا کیونکر ممکن ہوتا اور اگر ممکن ہوتا بھی تو وہ اس کو کس طرح سے سمجھ سکتا اور اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا۔ پھر اختتام نبوت کے ساتھ ہی اس علم کا فوراً عطا کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔ قدرت جلد باز نہیں بلکہ اپنے مقاصد کو ایک تدریج اور ترتیب کے ساتھ ایک اسکیم کے مطابق حاصل کرتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا بے سود اعادہ کر کے انہیں ضائع نہیں کرتی بلکہ آئندہ کی تخلیق کے لیے اپنی گزشتہ تخلیق سے پورا پورا کام لیتی ہے چونکہ انسان کو علمی صداقتوں کی جستجو کا ذوق اور ذہن رسا پہلے سے دے دیا گیا تھا۔ اس لیے اب اس علم کو انسان علم نبوت کی راہنمائی میں اپنی ذہنی کاوش سے خود بخود پیدا کر سکتا تھا۔ نبوت نے کم از کم نوع بشر کے ایک حصہ میں وہ صحیح وجدان پیدا کر دیا ہے جس کی مدد سے نوع بشر اپنی علمی جستجو کو بالآخر صحیح راستوں پر پہنچانے کے قابل ہو گی۔ نبوت کا عطا کردہ علم خواہ دنیا کی کوئی قوم اس کی حامل ہو، علم کے سمندر میں ایک روشنی کا مینار ہے جو نوع انسانی کو راہ سے بھٹکنے نہیں دیتا۔

فلسفۂ خودی کے ظہور کے متعلق قرآن کی پیشگوئی

آخر کار انسان نبوت ہی کی مدد سے اس قابل ہو گا کہ وہ علمی حقائق یا سلسلۂ عالم کے وہ حلقے جو نبوت نے آشکار نہیں کیے تھے، رفتہ رفتہ ان کو معلوم کر کے کائنات کے ایک ہی صحیح اور سچے فلسفہ کی تکمیل کرے۔

جب انسان اپنے علم کی ارتقاء کے اس نقطے پر پہنچے گا، (اور ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ ارتقاء خاتم النبیین کے ظہور کے بعد کے کسی زمانہ میں حاصل ہو سکتا ہے) تو اس وقت کہ قوموں کے اختلاف ختم ہو جائیں گے اور تمام دنیا قرآن کی حقانیت کو تسلیم کر لے گی۔ قرآن نے صریح الفاظ میں اس واقعہ کی پیشگوئی کی ہے۔

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔

ترجمہ:۔ عنقریب ہم ان کو اطراف عالم میں اور ان کی جانوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے

یہاں تک کہ ان پر آشکار ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے۔ یعنی ہم آفاق اور انفس کے بارہ میں انسان کو ایسے علمی حقائق کا انکشاف کریں گے جن سے قرآن کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔

یہ پیش گوئی اس زمانہ میں فلسفۂ خودی کے ظہور سے پوری ہوئی ہے کیونکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، فلسفۂ خودی دورِ حاضر کے الحاد کے خلاف اسلام کا کامیاب حربہ ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی صداقت کو آشکار کرتا ہے اور اس زمانہ میں آفاق اور انفس سے تعلق رکھنے والے بہت سے علمی حقائق کے انکشاف کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔

فلسفۂ خودی ابھی حقائقِ عالم کے پورے سلسلہ کو منکشف نہیں کرتا کیونکہ علم کا ارتقاء قیامت تک جاری رہے گا لیکن اتنے حقائق کو ضرور منکشف کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے (۱) یہ فلسفہ زندگی کے تمام موجودہ فلسفیانہ نظریات سے زیادہ معقول اور مدلل بن جاتا ہے۔ (۲) یہ باور کرنے کی وجوہات موجود ہو جاتی ہیں کہ آئندہ دریافت ہونے والے تمام علمی حقائق جن کی کوئی حد نہیں، فلسفۂ خودی کی جزئیات اور تفصیلات بہم پہنچائیں گے (۳) اسلام کے بنیادی اصولوں کا عقلی ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے۔ اور ان کے بارہ میں قرآن کے معانی معین ہو جاتے ہیں۔

فرقوں کے اختلافات کی وجہ

جوں جوں ہم خیر القرون سے دور ہوتے گئے ہیں ہم میں قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی کم ہوتی گئی ہے۔ خدا کے نیک بندوں اور پرہیزگار عالموں کے وجود کی برکت سے جو اس امت میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں ہمارے اس رجحان کی اچھی خاصی مزاحمت ہوتی رہی ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام ابھی تک زندہ ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسلام میں "نام نہاد علماء" کا ایک ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہا ہے جو یا تو قرآن کی روح سے ناواقف ہونے کے باعث نادانی کے ساتھ یا اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے بددیانتی کے ساتھ قرآن کی ایسی تفسیر کرتا رہا ہے جس سے اسلام کے بنیادی اصول بھی مسخ ہو جاتے رہے ہیں۔

اس افسوسناک صورت حالات کی وجہ سے اسلام میں فرقوں کا ظہور ہوا ہے۔ ہر فرقہ اپنے دعاوی کے ثبوت میں قرآن اور حدیث سے ایسے دلائل مہیا کرتا رہا ہے جنہیں تسلیم کرنے کے لیے اُسے سمجھدار اور پڑھے لکھے آدمیوں کی کافی تعداد مہیا ہو جاتی رہی ہے۔ مثلاً اسی قرآن سے ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ نبوت ختم ہو گئی ہے اور اسی سے ہم نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ نبوت جاری رہے گی۔ اسی قرآن سے ہم اس بات کی دلیل مہیا کرتے ہیں کہ جہاد بالسیف کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور اسی سے ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ جہاد بالسیف دین کا ایک اصولی تصور ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمان امن پسند ہے اور اس کو حکومت کفار کے ساتھ تعاون رکھنا چاہیے اور دوسرا کہتا ہے کہ آزادی کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں۔ ایک فریق کہتا ہے کہ وطنیت اور قومیت پرستی عین اسلام ہے اور اکھنڈ ہندوستان کا تصور غیر اسلامی نہیں۔ اور دوسرا قومیت پرستی کو شرک سے کم نہیں سمجھتا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ معلوم نہیں کہ یہ صورت حال کب تک جاری رہتی۔ اسلام کے اندر اور کتنے فرقے پیدا ہوتے اور قرآن کی آخری شکل و صورت کیا رہ جاتی۔

اختلافات کے خاتمہ کی صورت

لیکن جس خدا نے قرآن نازل کیا تھا اسی نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے فلسفہ خودی کو نمودار کر کے اس صورت حالات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آج سے پہلے ہماری خود غرضیوں اور نادانیوں کی وجہ سے قرآن ایک غیر معین اور بدلتی ہوئی چیز تھا اور ہمارے اس قسم کے فقرات کہ "قرآن ہمارے لیے کافی ہے"۔ "اپنے اختلافات کو مٹانے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرو"۔ "ترقی چاہتے ہو تو قرآن کی طرف واپس آؤ"۔ وغیرہ بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اب فلسفہ خودی کی وجہ سے جہاں تک اسلام کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے قرآن کے معنی معین ہو گئے ہیں اور اسلام ایک ایسی فکری وحدت بن گیا ہے جس کے اندر ہم کوئی تصور اپنی مرضی یا منشا کو پورا کرنے کے لیے داخل نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو خواہ ہم اس کی تائید میں قرآن و حدیث سے کتنی ہی عبارتیں نقل کرتے جائیں۔ دوسروں کو یہ سمجھنے میں دقت نہ ہو گی کہ یہ تصور اسلام کے باقی تصورات سے مطابقت

نہیں رکھتا۔ اور اس کی تائید میں قرآن اور حدیث سے جو عبارتیں نقل کی گئی ہیں، ان کی تعبیرات غلط ہیں۔ اس قسم کا تصور نہ صرف قرآن و حدیث کے صحیح مفہوم کے خلاف ہوگا۔ بلکہ کائنات کے تمام حقائق اس کی مخالفت کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ نئے اختلافات پیدا کرنا تو درکنار، اب ہم مجبور ہیں کہ اپنے پرانے اختلافات کو ترک کر کے واپس جائیں اور اسلام کی وہی توجیہ قبول کریں جو دراصل حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی ہے اور جو تنہا اس قابل ہے کہ عقلی طور پر ایک منظم شکل اختیار کر سکے۔

قوموں کے اختلافات کا علاج فلسفۂ خودی اسلام کے اندرونی اختلافات کا ایک قدرتی حل پیش کر کے اسلام کی پائداری کا سامان مہیا کرتا ہے اور لہٰذا اسلام کی صداقت کی دلیل ہے۔ اس کے بغیر اسلام فرقوں کے اختلافات میں کھو کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر فلسفۂ خودی اسلام کے اندر فرقوں کے اختلافات ہی کو نہیں۔ بلکہ اسلام کے باہر قوموں کے اختلافات کو بھی مٹاتا ہے۔ گو اس کے وجود میں آنے کا قریب ترین سبب قدیت کی یہ خواہش ہے کہ اسلام کی ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو اس زمانہ میں غلط فلسفوں نے پیدا کی ہیں لیکن ایک سچا فلسفہ ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت وقتی یا محدود نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ فلسفۂ خودی ام الکتاب یعنی اسلام کے بنیادی اصولوں کا فلسفہ ہے لیکن چونکہ اسلام کے بنیادی اصول ہی فطرت کے ابدی اور ازلی قوانین ہیں، اس لیے فلسفۂ خودی کسی خاص قوم گروہ یا مذہب کا فلسفہ نہیں بلکہ ساری نوعِ انسانی کا فلسفہ ہے۔ قوموں، فلسفوں اور مذہبوں کے اختلافات درحقیقت قوانین فطرت سے بے خبری کا نتیجہ ہیں اور چونکہ اس زمانہ میں ان قوانین کی منظم واقفیت فلسفۂ خودی کی صورت میں بہم پہنچ گئی ہے، ضروری ہے کہ جوں جوں اس فلسفہ کی واقفیت عام ہوتی جائے، ہر فرقہ، قوم اور مذہب کے سمجھدار لوگ اس سے اتفاق کرتے جائیں۔ اقبال کا یہی مطلب ہے جب وہ کہتا ہے ؎

طلسم بے خبری کافری و دین داری
حدیث شیخ و برہمن فسون و افسانہ

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز

فلسفۂ خودی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ Renaissance کی ابتداء کرتا ہے جس میں نہ صرف اسلام کو ایک زبردست سیاسی قوت حاصل ہوگی۔ اور اسلام کے اندر فرقوں کے اختلافات ختم ہوجائیں گے۔ بلکہ اسلام دنیا بھر میں پھیل جائے گا۔ قرآن نے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶۲:۳)

ترجمہ:۔ اور ان دوسروں میں بھی جو ہنوز ان سے نہیں ملے اس رسول کو بھیجا اور خدا غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں آخرین منھم کے الفاظ پہلی آیت کے لفظ اُمیّین کے مقابل پر پڑے ہیں اور للذا ان میں یہ کنایہ ہے کہ رسولؐ کی تعلیم نہ صرف اس وقت کے ان پڑھ لوگوں کو ہدایت کرتی ہے بلکہ اس میں آخری زمانہ کے ان لوگوں کے لیے بھی ہدایت کا سامان موجود ہے جو علم و حکمت میں ترقی یافتہ ہوں گے۔ اور اس آیت کے تتمہ میں جہاں خدا کی دو صفات عزیز (غالب رہنے والا) اور حکیم (حکمت والا) کا ذکر ہے یہ کنایہ ہے کہ اسلام کے آخری دور کے مسلمانوں کا عروج خدا کی ان دونوں صفات کا آئینہ دار ہوگا۔ اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ انہیں حکمت یا فلسفہ کے ذریعے سے غالب کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اسلام کا یہ آخری دور ابتدائی دور سے بھی بہتر ثابت ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

ابشروا ابشروا انما مثل امتی مثل الغیث لا یدری اٰخرہ
خیر ام اولہ او کحدیقۃ اطعم منها فوج عاما ثم اطعم

منہا فوج عاما لعل اخرها فوجاً ان یکون اعرضہا واعمقہا عمقاً واحسنہا احسناً الخ (مشکوٰۃ)

ترجمہ:۔ خوش ہوجاؤ خوش ہوجاؤ۔ بیشک میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتداء بہتر ہے یا انتہا یا اس باغ کی طرح ہے جس میں سے پہلے ایک فوج ایک سال تک خوراک حاصل کرتی رہی۔ اور پھر ایک اور فوج ایک سال تک خوراک حاصل کرتی رہی۔ ممکن ہے کہ دوسری فوج وسعت میں گہرائی میں اور عمدگی میں پہلی فوج سے بڑھ کر ہو۔

ان ارشادات کے ساتھ اگر ہم قرآن حکیم کی اس پیشگوئی کو بھی مدنظر رکھیں جس میں کہا گیا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱: ۵۳)

ترجمہ:۔ عنقریب ہم ان کو اطراف عالم میں اور ان کی جانوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے۔

تو اس مطلب کی اور بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔

اسلام کی والہانہ محبت

ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلام کی والہانہ محبت کا جو مقام مسلمانوں کو اسلام کے ابتدائی دور میں حاصل تھا وہ پھر کبھی عود نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے اس میں شک نہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ہے: خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم۔ لیکن ہم اس حدیث کی ایسی تشریح نہیں کر سکتے جو قرآن اور حدیث کے باقی ارشادات کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس حدیث کا مطلب فقط اس قدر ہے کہ جوں جوں مسلمان زمانہ نبوت سے دور ہٹتے جائیں گے، ان برکتوں سے بھی دور ہوتے جائیں گے جو نبوت کے ساتھ خاص ہیں اور ایسا ہونا ہر طرح سے قرین قیاس بھی تھا کیونکہ نبوت کا تق ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی ہیں جوں جوں ہم اس سے دور ہوتے جائیں کم ہوتی جاتی ہے لیکن

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں تک مسلمانوں کے ایمان اور اعتقاد کا تعلق ہے خیر القرون جیسا زمانہ پھر عود نہیں کر سکتا۔ بلکہ اوپر کی آیات و احادیث بتا رہی ہیں کہ اس قسم کا زمانہ پھر عود کرے گا۔ یہاں تک کہ یہ کہنا مشکل ہو گا کہ دونوں میں سے اچھا زمانہ کون سا ہے۔ پہلا یا آخری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اسلام کی شدید محبت حاصل تھی، اگرچہ نبوت کی ہدایت کے بغیر اس کا حصول ہرگز ممکن نہیں۔ لیکن وہ کوئی ایسا کمال نہیں تھا جو انسان کو نبوت کی زمانی قرب ہی سے حاصل ہو سکتا ہو۔ اور جس کے حصول کے لیے انسان کی فطرت کے اندر مستقل طور پر کوئی سامان نہ رکھا گیا ہو۔ نہیں۔ بلکہ نبوت کے زمانی قرب نے (اس کمال کی صورت میں) انسان کے ان فطری تقاضوں کو آسانی سے پورا کر دیا جو ہر وقت اپنا مکمل اطمینان چاہتے ہیں اور جو انسان کی تاریخ میں کسی نہ کسی وقت ساری نوع بشر کے لیے مکمل اطمینان پا کر رہیں گے۔ نبوت کے زمانی قرب نے ہمیں ایمان کی جس دولت سے مالا مال کیا تھا۔ اب اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں نبوت کا معنوی قرب جو فلسفہ اور سائنس کے ذریعے سے حاصل ہو گا پھر ہمیں اس سے مالا مال کرے گا اور یہ ایسا قرب ہو گا جسے زوال نہیں اور جو ہر دور زمانہ سے کم نہیں، بلکہ زیادہ ہوتا رہے گا۔

نبوت کا معنوی قرب

کسی نصب العین کے ساتھ شدید مخمونانہ محبت رکھنا انسان کی فطرت کا ایک ایسا تقاضا ہے جسے انسان روک نہیں سکتا۔ اور یہ تقاضا تصور کامل کی محبت سے مستقل اور مکمل طور پر پورا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ غلط نظریات کے پرستار اپنے نظریات سے ایسی شدید محبت رکھتے ہیں کہ ان کے لیے کسی قربانی کو زیادہ نہیں سمجھتے۔ جب ہم ایک باطل نظریہ کے ساتھ جو انسان کی فطرت کے مطابق اور جس میں بعض قابل نفت عناصر بھی مخفی ہوتے ہیں اسی قدر شدید محبت پیدا کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم زندگی کے ایک ہی صحیح اور سچے نظریہ کے ساتھ جو فطرت کے مطابق ہے جسے خدا کے پیغمبروں ہی کی تائید نہیں بلکہ کائنات کے تمام علمی حقائق کی تائید حاصل ہے، اس سے شدید تر محبت پیدا نہ کر سکیں۔ جوں ہی کہ ہم ان

رکاوٹوں کو دور کریں گے جو باطل تصورات نے ہماری محبت کے راستہ میں پیدا کر دی ہیں۔ ضروری بات ہے کہ ہم پھر اسلام سے ایک ایسی شدید محبت پیدا کر لیں جو اسلام کے اوّلین دور کی یاد کو تازہ کر دے۔ اس قسم کی محبت ہمارے تمام اخلاقی نقائص کا علاج کرے گی۔ اور یہ محبت فلسفہ کی تعلیم سے پیدا ہو گی۔

اسلام کے دو حصّے

ہر نظام تصورات کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک نظریہ یا عقائد Theory اور دوسرے عملی زندگی پر اس کا اطلاق یا اعمال Practice کامل نظام تصورات کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو عقائد سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا وہ حصہ جو اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔

ہر نظام تصورات کی صورت میں اعمال عقائد پر مبنی ہوتے ہیں۔ عقائد جڑ ہیں اور اعمال اس کی شاخیں۔ بلکہ اعمال کی نوعیت کا دار و مدار تمام تر عقائد کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ جیسا ہمارا عقیدہ ہو گا ویسا ہی ہمارا عمل ہو گا۔ عقیدہ خودی کا مقام ہے اور عمل خارج میں اس کا اظہار۔ عقیدہ وہی ہے جو دل میں ہو نہ کہ فقط زبان پر، اور جو عقیدہ دل میں ہو گا وہ لازمی طور پر اپنے مطابق خارج میں عمل پیدا کرے گا۔ اس لیے عقیدہ کی پہچان محض عمل سے ہوتی ہے۔

اساسیات یا عقائد

عقائد کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن حکیم نے ان احکام کے لیے جو عقائد سے متعلق ہیں، ام الکتاب (کتاب کی ماں یعنی منبع یا نچوڑ یا روح یا اصل یا بنیاد) کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے مراد یہ ہے کہ کتاب کے باقی احکام اُن کا نتیجہ ہیں یا ان پر مبنی ہیں۔ نیز چونکہ اسلامی عقائد انسان کے تصور یا ذہن کی پیداوار نہیں، بلکہ قدرت کے ازلی اور اَبدی قوانین پر مشتمل ہیں جن میں ردّ و بدل کی گنجائش نہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے ان کے لیے "آیتٌ مُحکمٰتٌ" (پختہ نشانیاں) کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ عقائد اسلام یا نظریہ اسلام میں توحید، ضرورتِ عبادت، ضرورتِ نبوت، اطاعتِ نبوت، ختمِ نبوت۔ اخلاق، جہاد، سیاسی آزادی، حیات بعد الممات، جزا و سزا وغیرہ تصورات شامل ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ فلسفہ

خودی اسلام کا فلسفہ ہے تو اسلام سے میری مراد عقائد اسلامی یا نظریۂ اسلام ہے جو اسلام کی بنیاد و اصل ہے۔ ہمیں ٹھیک طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ عقائدِ اسلام کی صحت اور عمدگی کا پکا یقین ہی ہمیں پکا مسلمان بناتا ہے اور ان ہی کا مضمحل یقین اسلامی کردار اور اخلاق ہم سے چھینتا ہے۔ ہمارے اعمال کی خرابی کی تہ میں ہمیشہ ہمارے عقائد کی خرابی ہوا کرتی ہے۔ اس دور میں ہم اسلام کے مطابق عمل سے محروم اس لیے ہیں کہ مغرب کے تصورات نے ہمارے عقائد کو روند ڈالا ہے۔ عقائد کے بگڑنے سے ہم بگڑتے ہیں اور ان کے سنورنے سے ہم سنورتے ہیں اور ہم ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے لوگ عقائد کے بگڑنے سے بگڑتے اور سنورنے سے سنورتے ہیں۔ عقائد دل سے تعلق رکھتے ہیں اور دل وہ چیز ہے جس کے سنورنے سے انسان سنورتا اور بگڑنے سے بگڑتا ہے۔ ہم میں سے بعض اسلام کے نظریہ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ اسلام عمل ہی کا نام ہے اور اسے کسی نظریہ سے کوئی واسطہ نہیں۔

نظریہ یا عقیدہ کے بغیر عمل ناممکن ہے

لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ نظریہ یا عقیدہ کے بغیر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ عقیدہ کے معنی کیا ہیں ایک مدعا کی خواہش۔ جب تک مدعا نہ ہو اس کے حصول کے لیے عمل سرزد کیونکر ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے اور دنیا کے خارجی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ پہلے یہ تبدیلی ہمارے ذہن میں یعنی ہمارے تصورات اور عقائد میں صورت پذیر ہو۔

پہلے ہم ایک نظریہ کو باور کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنے روزمرہ کے اعمال کا جائزہ لے تو اسے نظر آئے گا کہ ہر عمل جو اس نے کیا اس کے پیچھے ایک نظریہ یا فلسفہ موجود تھا۔ مثلاً اسے یقین تھا کہ یہ کام فلاں فلاں مقاصد کے لیے مفید ہوگا۔ اگر نظریہ پر اعتماد جم جائے تو عمل پیدا ہونے سے نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں عملوا الصّٰلحٰت کا ذکر ہے، وہاں اٰمنوا کا ذکر اس سے پہلے موجود ہے۔ اسلام کے نظریہ کو دل سے تسلیم کرنے کا نام ہی ایمان ہے۔ ہر عمل ایک عقیدہ پر مبنی ہے اور ہر عقیدہ ایک

فلسفہ ہے خواہ وہ کسی نوعیت اور معیار کا ہو۔ لہٰذا فلسفہ سے گریز نہیں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی عقائد رکھتا ہے جو اس کے اعمال کی تشکیل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے عقیدہ کو ایک منظم شکل دے لیتے ہیں اور بعض نہیں دیتے۔ لیکن جب ہم میں سے کوئی اپنی بات کو اچھی طرح سمجھانا چاہتا ہے یا اپنے عمل کی بنیاد یا اپنے نظریہ سے دوسروں کو متاثر کرنا چاہتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو زیادہ سے زیادہ عقلی ترتیب اور تنظیم سے آراستہ کرے، اور اس غرض کے لیے جہاں جہاں سے اسے حقائق میسر آئیں، کام میں لائے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جو عقیدہ عقلی تنظیم اور ترتیب سے آراستہ ہوگا، وہ دوسروں کو جلد متاثر کرے گا۔ فلسفہ کی اہمیت یہی ہے کہ وہ ذہنوں میں تبدیلی پیدا کر کے خارج میں تبدیلی کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ خواہ ہم اپنی زبان سے فلسفہ کے متعلق کچھ کہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کا دل کسی نہ کسی فلسفہ سے گہری طرح متاثر ہے۔ فلسفہ افراد اور جماعتوں کو حرکت میں لانے والی ایک زبردست قوت ہے۔ آپ دنیا کے جس علمی، اخلاقی، اجتماعی یا سیاسی انقلاب کا مطالعہ کریں گے آپ کو اس کی تہ میں ایک نیا فلسفہ کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اور اس کے برعکس تاریخ عالم میں انسانوں کی زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی ایسا فلسفہ ظہور میں نہیں آیا جو اپنے پیچھے ایک زبردست انقلاب نہ لایا ہو۔ انقلابات پیدا کرنے میں فلسفیوں کا اثر مخفی اور دھیما ہونے کے باوجود نہایت قوی اور یقینی ہوتا ہے۔

اقبال کی عظمت دنیا کا آخری فلسفہ اقبال کا فلسفہ خودی ہے اور دنیا کا آخری اور دائمی عالمگیر انقلاب اقبال کے فلسفۂ خودی کے پیچھے آنے والا ہے۔ شاید اس وقت بعض لوگ یہ سننا گوارا نہ کریں لیکن اقبال کی ساری عظمت درحقیقت اسی بات میں ہے کہ جس طرح سے کارل مارکس ذہنی اعتبار سے اس زمانہ کی حکومت روس کا بادشاہ ہے، اقبال ذہنی اعتبار سے مستقبل کی حکومت عالم کا بادشاہ ہے۔

اسلام کا دوسرا حصہ وہ ہے جو نظریہ کے عملی اطلاق application سے تعلق

رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نظریہ کا عملی اطلاق کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس میں ان لوگوں کے لیے جو مقامِ نبوت سے واقف نہیں، شبہ کی گنجائش ہے۔ مثلاً یہ شبہ کہ نمازیں پانچ کیوں ہیں، دو کیوں نہیں، یا روزے مہینہ بھر کے کیوں ہیں؟ اور سال کے ایک مقرر حصہ میں کیوں رکھے جائیں۔ وضو کا ایک خاص طریق کیوں مقرر ہے؟ نماز سے پہلے نہا لینا بھی تو صفائی کا مقصد پورا کر دیتا ہے۔ چور کو ریفارمیٹری میں بھیجنے کی بجائے ہاتھ کاٹنے کی سزا کیوں دی جائے؟ ان ممکن شبہات کی بنا پر قرآن نے ان احکام کو "اٰیٰتٌ مُّتَشٰبِهٰتٌ" کہا ہے۔ وہ لوگ جو ام الکتاب یا اسلام کے اصولی عقائد پر ایمان نہیں رکھتے، اپنی کج فہمی کی وجہ سے اسلام کے اس دوسرے حصہ پر اعتراضات کرتے ہیں اور پھر اپنے اعتراضات کی وجہ سے اسلام کے اصولی عقائد سے اور بھی دور ہو جاتے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (۳:۷)

ترجمہ:۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے قرآن کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصلی مطلب کی ٹوہ لگائیں۔

اسلام کے نظریہ کا عملی اطلاق خواہ کوئی صورت اختیار کرتا، کج دلوں کے اعتراضات ہر حالت میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا وحی نے اس کی وہ صورت اختیار کی جو خدا کے علم میں ہماری فطرت اور حالت کے پیشِ نظر بہترین تھی۔ وہ لوگ جن کا علم پختہ ہے، یعنی جو مقامِ نبوت سے پوری طرح آگاہ ہیں جانتے ہیں کہ نبی سے بڑھ کر تو کوئی شخص فطرت کے قوانین کا علم رکھتا ہے اور نہ اُس سے بہتر کوئی شخص انسان کی عملی زندگی پر ان کا اطلاق کر سکتا ہے کیونکہ وہ ان دونوں باتوں کے لیے براہِ راست خدا سے علم پاتا ہے۔ خواہ کوئی حکم ان کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ میدانِ جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی طرح کسی حکم کی علت کا مطالبہ نہیں کرتے۔ بلکہ یہ سمجھ کر اس کی علت خدا اور اس کے

اطاعتِ نبوت ارتقائے خودی کی شرط ہے

رسول کو ٹھیک معلوم ہے، ہر حکم کے سامنے تسلیم کا سر جھکا دیتے ہیں۔

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ (۳:۷)

ترجمہ:۔ اور اس کا اصلی مطلب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ لوگ جن کا علم پختہ ہے صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

ایسے لوگ نبی کی موبمو اطاعت کی وجہ سے نبی کے علم سے حصہ پاتے ہیں اور اپنے مقصد کو پہنچ جاتے ہیں۔ کائنات کا مقصد جس کی تکمیل انسان کے سپرد کی گئی ہے اور جو اس لیے انسان کا مقصد بھی ہے ارتقائے خودی ہے۔ ارتقائے خودی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہمیں تصوّرِ کامل سے کس قدر محبت ہے۔ اگر ہمارا دل تصورِ کامل کی محبت سے لبریز ہوگا تو ہم سے ایسے اعمال سرزد ہوں گے جو ہمارے ارتقاء کے لیے ممد و معاون ہوں گے۔ کامل نصب العین کی محبت جسے میں آئندہ اختصار کے لیے صرف محبت ہی کہوں گا، رسولؐ کی موبمو اطاعت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ رسولؐ کی اطاعت میں جو عمل سرزد ہوتا ہے، اس میں عمل سے بھی زیادہ رسولؐ کی اطاعت کی اہمیت ہے۔ اگر ہم اس سے دو چند عمل رسولؐ کی اطاعت کے بغیر کریں تو فائدہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم رسول کی مکمل تابعداری کرتے ہیں تو اس کی خودی کے ساتھ ہماری خودی کا ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے اور ہماری خودی رسول کی خودی سے ایک زیادہ سرے دیے سے جلتا ہے یا جس طرح ایک جھیل سے نہر نکل کر دوسری جھیل بنا دیتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو کلیتہً رسولؐ کی اطاعت میں دے دیتا ہے۔ وہ ایک نیا جنم لیتا ہے

اطاعتِ نبوت سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے

یہ جنم اس کے جسم کا جنم نہیں بلکہ اس کی خودی کا جنم ہے۔ جس کے بعد اس کی خودی رسولؐ کے علم سے تربیت پا کر اس طرح ترقی حاصل کرتی ہے جس طرح ایک نومولود بچہ ماں کے دودھ سے تربیت پا کر جسمانی ترقی

حاصل کرتا ہے۔ ارتقاء کی حیاتی سطح پر زندگی نسلی توالد کے ذریعے سے بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ یعنی حیوانات کی ایک قسم کے سارے افراد ایک باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس توالد میں قدرت متضاد جنسوں Opposite sexes. کی باہمی کشش سے کام لیتی ہے۔ ارتقاء کی نفسیاتی Psychological سطح پر زندگی کے پھیلنے اور بڑھنے کا طریقہ ایک قسم کا نفسیاتی توالد ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ایک نصب العین کو ماننے والے اپنے نصب العین کی محبت ایک ہی روحانی باپ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس توالد میں قدرت تابع اور متبوع کی باہمی کشش سے کام لیتی ہے جس طرح ایک جاندار وجود organism اپنی طرح کے دوسرے جاندار وجود کو پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک تصور اپنی طرح کے دوسرے تصور کو پیدا کرتا ہے۔ یعنی ایک انسان کا تصور دوسرے انسان کا تصور بن جاتا ہے، انسانی سطح ارتقاء پر نظام ہائے تصورات کی رنگا رنگی حیاتی سطح پر اقسام حیوانات کی بوقلمونی سے مشابہت رکھتی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ محبت یا علم سے بہرہ ور ہوں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم کچھ عرصہ کے لیے عقل بہانہ جو کی کشمکش کو موقوف کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اس طرح سے انحصار کریں جس طرح سے ایک جنین اپنی نشوونما کے لیے ماں کے جسم پر پورا پورا انحصار کرتا ہے۔ فقط اسی صورت میں ہم اپنی خودی کا وہ جنم پا سکتے ہیں جس کے بعد خودی کا ارتقاء شروع ہوتا ہے۔ پھر رسول کی پیہم اطاعت کی وجہ سے ہماری خودی کے ارتقاء کا ایک ایسا دور بھی آئے گا جب دین کے اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ہم نیک و بد کا ذاتی امتیاز کرنے لگ جائیں گے۔ ارتقائے خودی کے اس نقطہ پر ہمیں اعتقاد اور عمل میں رسولؐ کے ساتھ ایسی مشابہت حاصل ہوگی جو بیٹے کو شکل و صورت میں اپنے باپ سے ہوتی ہے کیونکہ ہمیں رسولؐ کی روحانی ابنیت کا فخر حاصل ہوگا۔ قرآن میں بارہا آل (اولاد) کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو ایک آقا سے جذباتی اثر یا کسی نصب العین کی محبت قبول کرتے ہیں۔

جس طرح حرارت ایک بلند درجۂ حرارت رکھنے والے جسم سے گزر کر کم درجۂ حرارت

نبوت نورِ خودی کا منبع ہے رکھنے والے اجسام میں جو اس سے چھوتے ہوں، سرایت کرتی ہے۔ یا جس طرح پانی ایک بلند سطح سے بہہ کر ان مقامات کو سیراب کرتا ہے جو اس کے آس پاس نیچے کی سطح پر واقع ہوں۔ اسی طرح سے زندگی کی لہر اس مقام سے گزر کر جہاں وہ سب سے زیادہ بلندی پر ہوتی ہے نوعِ انسانی کو مستفید کرتی ہے۔ خودی کا نور پہلے ایک مقام پر فراہم ہوتا ہے اور پھر وہیں سے اردگرد میں پھیلتا ہے۔ خاتم النبیینؐ کی ذات عالم انسانی میں خودی کا بلند ترین مقام ہے جہاں زندگی کا پانی فراہم ہوا ہے تاکہ نوعِ انسانی کی فطرت کی پیاس کو بجھائے اگر ہم زندگی کے پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے سرچشمہ یعنی رسولؐ کی ذات کے ساتھ ایک گہرا دلی تعلق قائم کریں۔ ورنہ ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ان تصریحات سے اگر یہ پتا چلتا ہے کہ خودی کا ارتقاء رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی **اطاعت کا تعلق دل سے ہے** کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اطاعت جو ایک شدید محبت یا قلبی تعلق کا نتیجہ نہ ہو۔ اور محض ایک رسم یا عادت کی صورت میں رہ گئی ہو، ارتقائے خودی کے لیے مفید نہیں۔ کیونکہ دراصل وہ اطاعت ہی نہیں بلکہ پابندیٔ رسم یا دورِ عادت کا ظہور ہے۔ بظاہر رسمی یا عادی اطاعت دلی اطاعت سے مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن درحقیقت پہلی قسم کی اطاعت ضعفِ عقائد کا نتیجہ ہے اور پھل کے ایک چھلکے کی طرح ہے جو بظاہر پھل نظر آتا ہے لیکن مغز سے خالی ہوتا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اطاعت بھی جسمانی تکلیف کے بغیر نہیں ہوتی۔ تاہم انسان کی خودی کی تربیت نہیں کرتی اور اُسے روحانی ترقی کی منزلوں پر آگے نہیں لے جاتی۔ بلکہ کولھو کے بیل کی طرح وہیں کا وہیں رکھتی ہے۔ دوسری قسم کی اطاعت پختگیٔ عقائد سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اس کا منبع ایک اندرونی جذب یا کشش ہوتا ہے اور وہ ایک بے ساختہ قدرتی عمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس لیے اس میں مومن کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ یہ نوافل کی صورت میں رفتہ رفتہ اپنا پھل لاتی ہے۔ یعنی مومن کی محبت **نوافل کی ضرورت** میں اضافہ کر کے اسے نوافل پر مائل کرتی ہے اور وہ خود بخود نوافل میں

اضافہ کرتا جاتا ہے اور ان میں ایک دلی رغبت محسوس کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُسے فرائض سے کم ضروری نظر نہیں آتے جن عبادات کو نوافل کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت فالتو اور غیر ضروری نہیں جیسا کہ ہم میں سے بعض کا خیال ہے۔ بلکہ وہ حد درجہ ضروری ہونے کے باوجود نوافل اسی لیے ہیں کہ ان پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ فرائض کی مخلصانہ ادائیگی سے جو مقامات مومن کی خودی کو یقینی طور پر حاصل ہوتے جاتے ہیں، ان مقامات پر وہ ایک زبردست اندرونی کشش کے ساتھ ان نوافل کی طرف زیادہ سے زیادہ شدت کے ساتھ مائل ہوتا جاتا ہے اور اس طرح سے اپنی ترقی کا سامان خود بخود پیدا کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بنیادی احکام یا فرائض کے اندر جو انتہائی مقاصد مخفی ہیں ان کو خود بخود پالیتا ہے۔ شارع علیہ السلام نے مومن کی آزاد انہ ریاضت اور عبادت کے لیے بہت سا میدان چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ خودی کی آزاد انہ اور اختیاری جدوجہد اس کی انتہائی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ پس مخلصانہ اطاعت سے انسان کی خودی اپنے ارتقاء کی منزلوں کو طے کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ انتہائی منزل پر جا پہنچتی ہے۔ جہاں اسے کہا جاتا ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ (۸۹: ۲۷)

ترجمہ: اے روح مطمئن اپنے پروردگار کی طرف چل۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ میرے بندوں میں شامل ہو اور میری بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

اخلاص اطاعت کی شرط ہے

وہ لوگ جو رسمی یا عادی اطاعت میں مشغول ہوتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جہاں تک عمل کا تعلق ہے دین کے لوازمات کو پورا کر دیا ہے اور لہٰذا وہ کسی اندرونی جدوجہد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اگرچہ یہ درست ہے کہ دین عمل ہے، لیکن یہ درست نہیں کہ عمل دین ہے۔ عمل دین کے بغیر بھی ہو سکتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے عمل میں دین کس قدر ہے۔ عمل کا مقصد خودی کی پرورش اور آخر کار خودی کا معراج ہے۔ اگر عمل اخلاص اور محبت سے کیا جائے گا تو خودی کی پرورش کریگا۔

ورنہ نہیں۔ اگر ہم ایک روبٹ robot کو نماز کی حرکت سکھادیں اور وہ پانچ وقت نماز پڑھ لے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے دین کا ایک رکن قائم کر دیا ہے۔ وہی عمل دین ہے جس کی بنیاد محبت پر ہو۔ عمل وہی ہے جو خودی کو حرکت میں لائے اور خودی جذب اور محبت کے بغیر حرکت میں نہیں آتی۔ قرآن نے ایسے عمل کی مذمت کی ہے۔

لَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُونَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُونَ۔

ترجمہ:۔ اور نماز کو آتے ہیں تو بس الکسائے ہوئے اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بددلی سے۔

قرآن ہم سے رسمی اور بے ذوق عمل کا مطالبہ نہیں کرتا۔ بلکہ اس عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس کی بنیاد انتہائی محبت اور اخلاص پر ہو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲ : ۱۶۵)۔

ترجمہ:۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۴۰ : ۱۴)

ترجمہ:۔ خدا کی خالص اطاعت مدنظر رکھ کر اس کو پکارو۔

اور حضورؐ نے فرمایا ہے:

الاحسان ان تعبد اللّٰه كانك تراه

ترجمہ:۔ احسان یہ ہے کہ تو خدا کی اس طرح سے عبادت کرے کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حسن عمل کی ایک ابتدا بھی ہے اور ایک انتہا بھی اور درمیان میں

ارتقاء خودی کی ابتداء اور انتہا

مشکلات ہیں جن کا عبور محنت اور کوشش چاہتا ہے لیکن ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم ابتداء کو انتہا سمجھ کر اپنی ترقی وہیں روک دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتداء ضروری ہے اور کبھی نظر انداز نہیں ہو سکتی کیونکہ انتہا نہ صرف اس سے

پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اسی پر قائم رہتی ہے۔ عمارت خواہ کتنی ہی بلند ہو لیکن اپنی بنیادوں سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ لیکن عمارت کی بنیاد اور عمارت ایک چیز نہیں۔ اسلام ابتدائی سبق پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ راستہ کی ابتدا پر کھڑا کرنے کے مومن کے انتہائی مقاصد کی طرف بھی واضح رہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً عبادت ذکر کا ابتدائی سبق پانچ وقت کی نماز ہے جو ہم پر فرض ہے۔ لیکن اس کا انتہائی مقصد درجہ احسان کا حصول اور تخلیق باخلاق اللہ ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے بار بار نماز کے علاوہ کثرتِ ذکر اور فکر کی ہدایت ہے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

انفاق فی سبیل اللہ کا ابتدائی سبق زکوٰۃ ہے لیکن اس کے اندر جو انتہائی مقصد ہے وہ یہ ہے کہ مومن اپنے بھائی کی ضروریات کو اپنی ضروریات سمجھے۔ دولت سے دل نہ لگائے اور جس چیز کی ضرورت نہ ہو، وہ اپنے پاس نہ رکھے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲:۲۱۹)

ترجمہ: اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ ان کو کہہ دو کہ جو کچھ بچ رہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳:۹۲)

ترجمہ: تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنے مال کا وہ حصہ جو تمہیں محبوب ہے خدا کی راہ میں صرف نہ کرو۔

اور حدیث میں ہے:

لایؤمن احدکم حتّٰی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہٖ

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اسلام کے جمود کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم مسلمان اسلام کی ابتدا کو ہی انتہا قرار دیتے رہتے ہیں جو شخص معراج یا خودی کی انتہا کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے اور اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور ہر آن اپنی ترقی کا جائزہ لیتا رہتا ہے وہ اس آسانی سے اس مقصود کو پالیتا ہے کیونکہ

یہی اس کی فطرت ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹ : ۶۹)

ترجمہ: جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت دے دیتے ہیں۔

چونکہ مستقبل کی عالمگیر اسلامی ریاست میں فرد کی خودی کے ارتقاء کے لیے تمام قسم کی سہولتیں موجود ہوں گی لہٰذا ہماری خودی کا ارتقاء اس قدر بلند مقام پر پہنچے گا کہ ریاست کو اسلامی تعزیری اور اور اصلاحی قوانین کو حرکت میں لانے کا موقع پیدا نہ ہوگا۔ مستقبل کی اس ریاست میں چوری کا قانون ہوگا لیکن نہ کوئی چوری کا ارتکاب کرے گا اور نہ کسی کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئے گی۔ زکوٰۃ کا قانون ہوگا لیکن لوگ حرص و ہوس پر اس طرح فتح پا چکے ہوں گے اور دولت سے ایسے بے نیاز ہوں گے کہ نہ تو کسی کے پاس فالتو دولت ہوگی جس پر زکوٰۃ کا ٹیکس لگایا جائے اور نہ ہی کوئی شخص ایسا رہے گا جو تنگ دستی کی وجہ سے کوئی صدقہ یا امداد قبول کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تصدقوا فانه یاتی علیکم زمان یمشی الرجل بصدقته فلا یجد من یقبلها یقول الرجل لو جئت بالامس لقبلتها فاما الیوم فلا حاجة لی فیها (بخاری)

ترجمہ: خیرات کرو۔ بیشک تم پر ایک ایسا وقت آ رہا ہے کہ ایک شخص خیرات کو لے کر پھرے گا لیکن اسے قبول کرنے والا نہ پائے گا۔ آدمی اسے کہے گا اگر تو کل آتا تو میں اسے قبول کر لیتا۔ لیکن آج مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

۵۔ مریض کا تعاون

فلسفہ خودی اگرچہ مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کے خلاف اسلام کے قدرتی ردِ عمل

کے طور پر ظاہر ہوا ہے اور یہ اپنا مقصد پا کر رہے گا لیکن ایک سمجھدار مریض کی طرح جو اپنی صحت کی خاطر غذا اور دوا کے استعمال میں طبیب سے پورا پورا تعاون کرتا ہے ہمیں چاہیے کہ ہم خود بھی اس ردِ عمل کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں تاکہ یہ آسانی کے ساتھ اپنے کمال کو پہنچے اور جسمِ ملت کی مکمل صحت کا موجب ہو اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہم اس کے صحت بخش اثرات کو ملت کی رگوں میں خونِ زندگی کے ساتھ دوڑنے کا موقع دیں یعنی اپنی تعلیم کے تمام ذرائع کو جو اس وقت مغرب کے غلط تصورات کی نشر و اشاعت کے لیے وقف رہے ہیں فی الفور اس فلسفہ کی نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ان ذرائع تعلیم میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعۂ تعلیم خود ریاست ہے اور اس کے ماتحت اور اس کے اندر سکول، کالج، ریڈیو، سینما، پریس، پلیٹ فارم، گھر اور سوسائٹی کی طرح کے اور ذرائع تعلیم ہیں جب تک فلسفۂ خودی ہماری ریاست کا اپنا نظریہ۔ سرکاری نظریہ قرار نہ پائے یہ ہمارے مرض کے ردِ عمل کی حیثیت سے نہ تو اپنے کمال کو پہنچ سکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ریاست نظریہ کے بغیر نہیں ہوتی۔ اگر فلسفۂ خودی ہماری ریاست کا نظریہ نہ ہوگا تو ضروری بات ہے کہ اس کا نظریہ یا تو اسلام کے علاوہ کوئی اور ہوگا یا اگر اسلام ہوگا تو اس کی تشریح اور تفسیر کے لیے فلسفۂ خودی کے علاوہ کوئی اور نقطۂ نظر کام میں لایا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں ریاست کے ماتحت اور اس کے اندر کے تمام ذرائع تعلیم جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، فلسفۂ خودی کی پالیسی نشر و اشاعت کے لیے کام میں نہ آ سکیں گے جو اس کے مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے۔

قدرت کی تائید اور ہمارا فرض

لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ فلسفۂ خودی اپنے مقصد کو پا کر رہے گا۔ گو اسے اپنے مقصد کو پانے کے لیے ایک ریاست کو کام میں لانا ضروری ہے کیونکہ اسلام کا وہی ردِ عمل جس نے ایک طرف فلسفۂ خودی کو پیدا کیا ہے، اس نے دوسری طرف

پاکستان زمانہ کے غلط تصورات کے خلاف اسلام کے ردِ عمل کو کمال پر پہنچانے کے لیے وجود میں آیا ہے

ایک ایسی ریاست کو بھی پیدا کیا ہے جسے فلسفۂ خودی اپنے مقصد کے لیے کام میں لا سکتا ہے۔ پاکستان کا تصور بھی اسی اقبال کی ایجاد ہے جو فلسفۂ خودی کا موجد تھا۔ یہ امر کہ یہ دونوں نعمتیں ایک ہی خطے کے مسلمانوں کے سپرد کی گئی ہیں اور دونوں کے ظہور میں وقت کا ٹھیک ٹھیک تطابق بھی ہے، اتفاقی نہیں۔ بلکہ اس کے تحت قدرت کی یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ کامل نظام افکار کو اور اس کی معرفت تمام دنیا کو باطل فلسفوں سے نجات دلا کر دنیا کے ارتقاء کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔ پس قدرت پاکستان اور فلسفۂ خودی دونوں کو ہمرکاب کر کے اپنے مقصد کو پورا کرے گی۔ اسلام کامل نظام تصورات کی حیثیت سے دنیا کا راہنما اور دنیا کے ارتقا کا زینہ ہے۔ اسے دنیا کے ان فلسفوں پر جو اس وقت اسے چیلنج دے رہے ہیں، غالب ہو کر زندہ رہنا ہے۔ ایک طرف تو اسلام کی زندگی کو شدید خطرہ کے بغیر اب اس چیلنج کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ اور دوسری طرف بظاہر پاکستان کے سوائے دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے اسلام اس چیلنج کے جواب کا آلۂ کار بنا سکے۔ پس کائنات کے ارتقاء کی مخفی قوتیں ہمیں مجبور کریں گی کہ ہم فلسفۂ خودی کو پاکستان کا سرکاری نظریہ بنائیں۔ اس وقت بھی ان قوتوں کا عمل پاکستان کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کے اس مطالبہ کی صورت میں اظہار پا رہا ہے کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنایا جائے۔ بالآخر اس مطالبہ[1] کی کامیابی ضروری ہے۔ اور جب یہ مطالبہ کامیاب ہوگا اور اسلام ریاست کا مدعا قرار پائے گا تو پھر اسلام کی سرکاری ترجمانی کے لیے فلسفۂ خودی کو کام میں لانا بھی ضروری ہوگا کیونکہ اس کے بغیر ہماری ریاست کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ معقول اور قابل قبول دلائل کی بنا پر اسلام کے اندرونی فرقوں کو اتحاد کی دعوت دے سکے۔ یا اسلام کو بیرونی دنیا کے سامنے ایک عالمگیر علمی نظام تصورات کی صورت میں پیش کر کے اپنے سیاسی

---

[1] اب وزیر اعظم کی قرار دادِ مقاصد کے منظور ہونے سے یہ مطالبہ مانا جا چکا ہے اور یہ واقعہ فلسفۂ خودی کی توقعات کے عین مطابق ہے۔

نصب العین کی عظمت اور ضرورت کا قائل کر سکے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن کا علم ترقی پذیر ہے، اور اس زمانہ میں غلط فلسفیانہ نظریات کا قلع قمع کرنے اور اسلام کی عمومی اندرونی اور بیرونی مشکلات کا ازالہ کرنے کے لیے ترقی کر کے ایک نئی سطح پر پہنچ گیا ہے تو ہماری اسلامی ریاست اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس علم کو کیونکر نظر انداز کر سکے گی اور اپنے مدمقابل نظریات کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا صورت اختیار کرے گی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ چونکہ فلسفہ نخودی اسلام کی فلسفیانہ تشریح اور تفسیر ہے لہٰذا فلسفہ نخودی کو ریاست کا سرکاری نظریہ بنانے کے معنی فقط یہ ہیں کہ اسلام کو ریاست کا نظریہ بنایا جائے اور فلسفہ نخودی کو اس کی سرکاری ترجمانی کے لیے کام میں لایا جائے۔ مختصراً قدرت نے جو حالات اس وقت پیدا کیے ہیں، وہ ہمیں ایک ایسی راہ اختیار کرنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں جس سے زمانہ کے باطل کے خلاف اسلام کا ردِ عمل اپنے کمال کو پہنچے گا لیکن اگر قدرت کے ساتھ تعاون نہ کر سکے تو پھر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا ہمارا محتاج نہیں ہم اس کے محتاج ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ

ترجمہ:۔ اے لوگو تم اللہ کے محتاج ہو اور خدا بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔

اور خواہ ہم اسلام سے کتنے ہی روگرداں ہوں اور خواہ یہ بات ہمیں اس وقت کیسی ہی مشکل نظر آئے لیکن اسلام پھر بھی اس دور کے غلط نظریات پر جو اُسے برباد کر دینے پر تُلے ہوئے ہیں غالب ہو کر زندہ رہے گا۔ البتہ یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہم سازگار حالات کے باوجود

مقاصد قدرت کے لیے بیکار ثابت ہونا موت کو دعوت دینا ہے

جو قدرت ہمارے لیے پیدا کر رہی ہے، قدرت کے ارادوں کے ساتھ تعاون کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں ہم مقاصد ارتقا کے لیے بیکار بلکہ مضر سمجھ کر نظروں سے گرا دیے جائیں گے۔ سلطنت کی نعمت ہم سے چھین لی جائے گی اور ہمیں ذلت کی زندگی بسر کرنے اور آخر کار مٹ جانے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا اور ہماری جگہ کسی اور قوم کو کھڑا کر دیا جائے گا جو اسلام

کی خدمت کرنے اور لوگوں کی ملامت سے بے پرواہ ہو کر زمانہ کے باطل کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے تیار ہوگی۔ پھر سلطنت، دولت، علم اور دنیا کی تمام نعمتیں اسی قوم کو دے دی جائیں گی۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محض میرے تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ قرآن حکیم کی متعدد آیات اس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۵ : ۵۴)

ترجمہ: مسلمانو اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین سے منحرف ہو جائے تو خدا کو اس کی پرواہ نہیں وہ ایسے لوگوں کو پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور وہ اسے دوست رکھیں گے۔ مسلمانوں کے حق میں نرم اور کافروں کے حق میں سخت ہوں گے۔ خدا کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کا باک نہ رکھیں۔

إِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم (۴۷ : ۳۸)

ترجمہ: اگر تم اسلام سے منحرف ہو جاؤ تو خدا تمہیں مٹا کر تمہارے عوض میں اور قوم لائے گا۔ پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

جب ہم ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ زندگی تخلیق کے اس حصہ کو فروغ نہیں دیتی بلکہ قائم نہیں رکھتی جو مقاصد ارتقاء کے لیے مفید ثابت نہ ہو سکے اسی بنا پر حیوانات کی لاکھوں قسمیں آج تک مٹ چکی ہیں اور اسی بنا پر سینکڑوں تہذیبیں اور ان کی حامل قومیں دنیا سے رخصت ہو گئی ہیں اور قرآن نے ہمیں ان قوموں کی تاریخ سے بار بار عبرت دلائی ہے تاکہ ہم ان کی طرح نہ ہوں بلکہ اپنے آپ کو مقاصد قدرت کے مددگار

ثابت کر کے خدا کے انعامات کے حقدار نہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ (۳۱:۳۶)

ترجمہ:۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کیا ہے اور وہ ہلاک ہونے کے بعد ان کی طرف لوٹ کر نہیں آتے۔

عروج اور زوال کی راہیں واضح ہیں

قدرت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کائنات میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جہاں حالات سازگار پاتی ہے، وہاں ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ پھر اگر حالات یعنی انسانوں کے اعمال اور افعال اس قدم کی موافقت کریں تو دوسرا اور تیسرا قدم اٹھاتی چلی جاتی ہے۔ اگر اس راستہ کے کسی مقام پر وہ مزید ترقی کے لیے حالات سازگار نہ پائے تو پھر پہلا قدم بھی واپس لے لیتی ہے اور ایک نئی کوشش کا آغاز کرتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی پیہم ترقی کے لیے موافق حالات پالیتی ہے۔ جب قدرت کے پہلے قدم کی واپسی عمل میں آتی ہے تو ایک قوم کا عروج زوال میں بدل جاتا ہے اور پھر ایک دوسری قوم کو آزمایا جاتا ہے اور اُسے وہی مواقع دیے جاتے ہیں جو اس قوم کو دیے گئے تھے۔ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا:

إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ (۴۷:۷)

ترجمہ:۔ اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔

ہم چاہیں تو دنیا کی بادشاہت ہماری ہے

ہمارے انحطاط کی انتہا کے زمانہ میں ہمارے حق میں قدرت کا پہلا تائیدی قدم یہ تھا کہ اس نے ایک فلسفی شاعر ہم میں پیدا کیا جو اسلام کی گہری بصیرت رکھتا تھا جس نے اسلام کا ایک نیا فلسفہ ہمیں دیا اور اس فلسفہ کو گا کر سنایا۔ ہم نے اس کے پیغام کو سراہا اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس کے عوض میں خدا کا دوسرا احسان ہم پر یہ ہوا کہ ہمیں ایک ریاست عطا کی گئی جس کا مطلب یہی ہے کہ ہم اسلام

کے پیغام اور فلسفہ کو ریاست کی اساس بنائیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو یقیناً ہم پر ایک ایسے انعام کا دروازہ کھل جائے گا جس کا تصور میں لانا بھی اس وقت مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن جس کا عطا کرنا خدا کے لیے مشکل نہیں۔ میری مراد دنیا کی حکومت سے ہے جس کا وعدہ خدا نے دیر سے کر رکھا ہے کہ یہ آخر کار اس قوم کا انعام ہوگا جو اپنے آپ کو اس کی حق دار ثابت کرے گی اور کرتی رہے گی۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝

ترجمہ:۔ ہم نے زبور میں وعظ و نصیحت کے بعد یہ بات بھی لکھ دی کہ میرے نیکوکار بندے ہی آخر کار زمین کے وارث ہوں گے۔ (۲۱ : ۱۰۵)

لیکن اگر ہم نے قدرت کے اس تازہ اقدام کی تائید نہ کی تو تعجب نہیں کہ قدرت پاکستان بھی ہم سے چھین لے اور اسلام کا باطل شکن فلسفہ جو ہمیں دیا گیا ہے دوسروں کے سپرد کر دے کہ وہ اسے اوروں تک پہنچائیں اور دنیا کو باطل سے بچائیں۔ باطل کی قوت اس وقت ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ گئی ہے کہ یا تو اسلام مٹ جائے گا یا فوراً دنیا پر پھیل جائے گا لیکن اسلام اس زمانہ میں نئے علمی ہتھیاروں کے ساتھ اس لیے آراستہ نہیں ہوا کہ وہ باطل سے مٹا دیا جائے بلکہ اس لیے ہوا کہ وہ باطل کو مٹا دے۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی فطرت میں مٹنا نہیں بلکہ مٹانا اور غالب رہنا ہے اگر ہم نے حق و باطل کی اس آخری کشمکش میں اس فریق کا ساتھ دیا جو یقینی طور پر غالب رہنے والا ہے تو یہ ایک معمولی قسم کی مصلحت بینی ہوگی اور پھر دنیا کی حکومت ہمارے سوائے اور کس کی ہے۔

حق و باطل کی کشمکش کا بحرانی نقطہ

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان ایک کمزور چھوٹا سا ملک ہے جو بالخصوص ایٹم بم کے اس زمانہ میں دنیا کی بڑی طاقتوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن قوموں کا عروج و زوال نہ تو ان کے

خودی کائنات کے تقاضوں کی اعانت قومی عروج کی ضمانت ہے

ظاہری مادی اسباب پر منحصر ہے اور نہ ان کی قوت سعی و عمل پر بلکہ اس کا دارومدار کائنات کی باطنی قوتوں کے عمل پر ہے۔ جو قوم بھی ان قوتوں کے زور رکھنے والے عمل کو اپنے موافق اور مطابق کرے گی، وہ زندہ رہے گی اور دوسری قومیں خواہ ان کے ظاہری اسباب کچھ ہوں مٹ کر فطرت کی اس چہیتی قوم کے لیے راستہ صاف کر دیں گی جس طرح سے ایک فرد کی خودی کے اندر جذبۂ حسن و کمال موجود ہے اسی طرح سے کائنات کی خودی میں بھی ایک جذبۂ حسن و کمال ہے اور قوموں کا عروج و زوال بلکہ کائنات کی ساری ارتقائی حرکت اس جذبہ کے اظہار و اطمینان کے لیے ہے اور قدرت نے جو انسان میں جذبۂ حسن و کمال رکھا ہے وہ بھی اسی غرض سے ہے، کہ انسان اس کے ساتھ مل کر کام کرے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے جو قوم کائنات کے اندرونی جذبۂ حسن و کمال کی مؤید ہو گی، دوسرے الفاظ میں جو قوم آخر کار کامل نظام تصورات کو اپنی زندگی کی حقیقی بنیاد بنائے گی، وہ روئے زمین پر حکومت کرے گی کیونکہ اس کے ظاہری حالات خواہ کیسے ہی مایوس کن ہوں فطرت اسے عروج و کمال پر پہنچانے کے لیے بیتاب ہے اگر وہ تہی دست و نادار ہو گی تو دولت دوسروں سے چھین کر اُسے دے دی جائے گی اگر اس کے پاس سامانِ جنگ نہ ہو گا تو اسے اجازت دے دی جائے گی کہ دوسروں کا سامانِ جنگ چھین کر اپنے قبضہ میں لے لے۔ اگر وہ بے علم و بے ہنر ہو گی تو اُسے علم و ہنر سے آراستہ کیا جائے گا۔ اگر وہ عمل سے محروم ہو گی تو دوسروں کے ہاتھ پاؤں شل کیے جائیں گے اور اسے قوتِ سعی و عمل سے نوازا جائے گا۔ قدرت ان تمام ترقیوں سے جو وہ نوعِ انسانی کو آج تک نصیب کرتی رہی ہے، صرف ایک قوم کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اور وہ خاتم النبیینؐ کی اُمت ہے۔ اگرچہ اس قوم کی تعمیر کے سامان کا بہت سا حصہ اس وقت دوسری قوموں میں بکھرا ہوا ہے، لیکن بالآخر وہ یکجا کر کے اسی قوم کے سپرد کیا جائے گا۔ مسلمان مطمئن رہیں کہ جو کچھ دنیا پیدا کر چکی ہے وہ ان ہی کا ہے اور جو کچھ دنیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی الواقع ایک کامل نظامِ تصورات کی حیثیت سے کام میں لائیں یعنی اُسے اپنی سیاسی زندگی کا روح د

ورواں بنائیں۔

اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ایک راہ تو انتہائی قسم کی ترقیوں کی طرف

عزت اور ذلت کی راہیں

جاتی ہے جس میں کوئی حقیقی خطرہ نہیں، کوئی مستقل شکست اور ناکامی نہیں جس میں دشمنوں کی ذلت اور بربادی ہے اور اپنی عزت اور کامرانی اس راہ کی آخری منزل دنیا کی حکومت ہے۔ دوسری راہ میں سطحی اور عارضی تسلیاں لیکن گہری اور مستقل ناکامیاں اور نامرادیاں ہیں جن کا آخری نتیجہ مکمل بربادی ہے۔ اگر ہم نے اسلام کو سچ مچ اپنی سیاسی زندگی کی اساس بنالیا تو ہم فی الفور ناکامی کی راہ سے ہٹ کر کامیابی کے راستہ پر ہو لیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کو سیاست کی بنیاد بناتے ہوئے ہمیں کئی ایک تشویش انگیز مشکلات کا

ہماری مشکلات

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ہماری پہلی مشکل تو یہ ہے کہ خواہ ہم دنیا کو اس بنا پر اچھا سمجھیں یا بُرا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں دنیا مذہب سے بے حد متنفر ہے اور ایک مذہبی ریاست کے قیام کو ایک رجعتی حرکت تصور کرتے ہوئے اُسے آسانی سے گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم اس زمانہ میں بالخصوص دنیا کی رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ ہم مجبور ہیں کہ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کریں۔ ہم اپنی فلاح و بہبود کی بہت سی باتوں کے لیے ان پر دار و مدار رکھتے ہیں اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم تعلیمی، ثقافتی، سیاسی، تجارتی معاشی اور فوجی بین الاقوامی انجمنوں میں اپنے احترام کو برقرار رکھیں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے اس میں اور اضافہ کریں اور اقوام عالم کی زیادہ سے زیادہ ہمنوائی حاصل کریں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کم از کم اپنی سیاسی زندگی کے اس ابتدائی دور میں ہمیں خطرات کو مول نہیں لینا چاہیئے۔ اگر ہم نے پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنا دیا تو ہمارے دشمنوں کو ہمارے خلاف غلط نفرت پھیلانے کا ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا۔

ہماری دوسری مشکل یہ ہے کہ ہمارے علماء قرآن کی تفسیر میں اختلاف رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہم فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم کس فرقہ کے اسلام کو ریاست کی بنیاد قرار دیں ہماری

تیسری مشکل یہ ہے کہ ہماری اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے لیے مشکل ہوگا کہ ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے مسلمانوں کے ساتھ برابری کا احساس کر سکیں اور اُس اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں یا ریاست کی خوشحالی اور ترقی میں وہ دلچسپی لے سکیں جو ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست کی صورت میں ان کے لیے ممکن ہے۔

مشکلات کا قدرتی حل

یہ مشکلات ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر بعض لوگوں نے شک کیا ہے کہ اگر پاکستان کو فی الواقع عملی طور پر ایک اسلامی ریاست بنانے کی کوشش کی گئی تو ہم کامیاب بھی ہو سکیں گے یا نہیں لیکن خوش قسمتی سے فلسفۂ خودی ہمیں ان مشکلات کا مکمل اور قدرتی حل ٹھیک وقت پر بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں عرض کر چکا ہوں کہ کس طرح سے فلسفۂ خودی اصول اسلام کی صحیح تشریح ہے جو اسلام کے تمام فرقوں کو متحد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یہ بالکل قرینِ قیاس ہے کہ جونہی فلسفۂ خودی ہمارا سیاسی نظریہ تسلیم ہوگا ہماری قوم کی ذہنی کیفیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا جس کی وجہ سے فرقوں کے اختلافات اپنی اہمیت کھو دیں گے اور رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہو جائیں گے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ کس طرح سے فلسفۂ خودی اسلام کے بنیادی اصولوں کو ناقابلِ فہم عقائد dogmas نہیں رہنے دیتا۔ بلکہ اسلام کو ایک عقلی نظریۂ زندگی

پاکستان ایک عقلی نظریہ زندگی پر قائم ہوگا

(intellectual ideology) کے طور پر پیش کرتا ہے جو ریاست اس قسم کے نظریۂ زندگی پر مبنی ہوگی وہ ایک تھیوکریسی نہیں ہوگی۔ بلکہ ان جدید قسم کی ریاستوں میں سے ایک ہوگی جو اس زمانہ میں فلسفیانہ نظریات کی حامل ہیں۔ لہٰذا یہ بات عصرِ جدید اور پاکستان کی اقلیتوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ بلکہ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہات ہیں کہ موجودہ دنیا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہماری شکر گزار ہوگی کہ ہم نے فطرتِ انسانی کے متعلق ایسی معلومات بہم پہنچا کر جن کی کمی اس دَور میں شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی دنیا کی راہنمائی کی ہے اور علم کے ایک بڑے خلا کو پُر کیا ہے ایک اقلیت جب تک اقلیت ہے، مکمل طور پر مطمئن نہیں ہو سکتی تاہم جب ہمارے معقول دلائل

کی بنا پر اقلیتوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور کیوں چاہتے ہیں تو ان کے لیے ایک حد تک ہمارے ساتھ اتفاق کرنے کا راستہ کھل جائے گا اور پھر ہم اپنا نظام تعلیم اس طرح سے تعمیر کریں گے جس سے دنیا کی غیر مسلم اقوام کو ہمارے تصورات کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جائیگی۔

حال ہی میں دنیا کی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے یعنی اب وہ قومیت کے تصورات سے کسی قدر الگ ہو کر زندگی کے فلسفیانہ تصورات پر استوار ہو رہی ہے آج ہر قوم اور ہر ریاست کا اپنا ایک الگ فلسفہ ہے جس پر وہ نازاں ہے اور جس قوم کا کوئی فلسفہ نہیں وہ سرعت کے ساتھ ایک فلسفہ کی تعمیر میں مشغول ہے۔ اشتراکیت ایک فلسفہ ہے فاشیت اور نازیت بھی فلسفے تھے جو سیاسی حیثیت سے مٹ گئے ہیں اور امریکہ اور انگلستان کے لوگ اب جمہوریت کو ایک طرز حکومت نہیں سمجھتے بلکہ ایک نظریۂ زندگی کے طور پر اس کی تشریح کرتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ حکومت بظاہر گاندھی کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی پیرو ہے۔ اس دور میں جس طرح فلسفۂ خودی کے ظہور اور پاکستان کے قیام نے اسلام کے لیے موافق حالات پیدا کیے ہیں اسی طرح سے فلسفہ کی جانب اقوام عالم کے رجحان نے بھی اسلام کے لیے زمین ہموار کر دی ہے۔ یہ سارے حالات قدرت کے ایک ہی مقصد کی نشان دہی کر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دنیا کا اعلیٰ ترین اور صحیح ترین فلسفہ یعنی فلسفۂ خودی کہیں نہ کہیں ایک سیاسی قوت کے طور پر ظہور پائے اور عالمگیر قبولیت حاصل کرے یقیناً پاکستان کے مسلمان دنیا کے اس ذہنی انقلاب کے آلۂ کار بنیں گے ؎

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

سیاست کا نیا دور فلسفۂ خودی کا منتظر ہے

عصر جدید کو اپنا طرفدار کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم فلسفۂ خودی کو ریاست کا نظریہ قرار دینے کے بعد ریاست کے اندر اور باہر اس کی نشر و اشاعت کے لیے تعلیم اور تبلیغ کے تمام ذرائع وقف کر دیں ہماری کوشش

تعلیم و تبلیغ کی زبردست قوتوں کا استعمال

یہ ہونی چاہیئے کہ اپنے تعلیمیافتہ طبقہ کے ذہین ترین افراد کی ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو اس فلسفہ سے بخوبی واقف ہو اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے موزوں قسم کا لٹریچر کثرت سے پیدا کرے۔ یہ لٹریچر دنیا کی ہر زبان میں شائع ہو۔ ہمیں اپنا جہاد دونوں محاذوں پر (ریاست کے اندر اور باہر) بیک وقت شروع کرنا چاہیئے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے مدد و معاون ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ پہلے اپنی قوم کو درست کر لیں پھر دوسروں کی باری آئے گی تو ہم اپنی قوم کو درست کرنے کا ایک اہم ذریعہ ترک کر دیں گے کیونکہ دوسروں کو تبلیغ کرنا اپنے آپ کو درست کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ ہمارے گھر کی خرابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے گھر سے باہر دنیا کی خرابی کا غم نہیں کھایا۔ غلط تصورات کی تعلیم اور تبلیغ سے ہم بگڑے ہیں بلکہ تمام دنیا بگڑی ہے اور صحیح تصورات کی تعلیم اور تبلیغ ہی سے ہم درست ہوں گے اور ہمارے ساتھ تمام دنیا درست ہوگی۔

یہ بات کہ فلسفۂ خودی ایک فلسفہ ہے، ہمارے لیے اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے میں کوئی مشکل پیدا نہیں کر سکتی جب ہم اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ فلسفۂ خودی دین کا علم ہے جس کے بغیر اس زمانہ میں ہمارا چارہ نہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی طرف انتہائی شوق سے متوجہ نہ ہوں۔ فلسفہ اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں۔ آج سے پہلے بھی ہم اسلام کو ایک فلسفہ سمجھتے رہے ہیں اور ہمارے علماء میں سے جس قدر کوئی زیادہ فلسفی تھا اور نکات قرآنی کی فلسفیانہ تشریح و تفسیر کا اہل تھا اسی قدر زیادہ قابل اور مقبول سمجھا جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس زمانہ میں فلسفۂ اسلام ارتقائے علم کی وجہ سے اپنے کمال کو پہنچا ہے کیونکہ اس کے مقابل پر کفر نے بھی فلسفہ میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ فلسفۂ خودی سچا فلسفہ ہونے کی وجہ سے تمام فلسفوں سے زیادہ آسان ہے۔ ایک فلسفہ اس وقت مشکل ہوتا ہے جب فلسفی ایسی بات کو جو فی الواقع غلط ہو اپنے زور بیان اور پرواز تخیل سے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن صحیح اور سچی باتیں فوراً قلم سے نکلتی اور دل میں اُتر جاتی ہیں۔ اب زمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری قوم سائنس اور فلسفہ سے

اب فلسفہ سے شغف پیدا کرنا اشاعت اسلام کے لیے ضروری ہے۔

الفت پیدا کرے۔ اگرچہ اس وقت ہماری قوم علم سے اپنا پرانا شغف کھو چکی ہے لیکن تعلیم سے ہم پھر ان میں علم کا وہی ذوق و شوق پیدا کر سکتے ہیں جو پہلے ہمارا امتیاز تھا۔ تعلیم قلب ذہنیت

تعلیم کا جادو

کا ایک زبردست آلہ ہے۔ تعلیم سے ہم اپنی قوم میں فلسفیانہ ذہنیت پیدا کر سکتے ہیں اور جس حد تک چاہیں ان میں اپنے نصب العین کی محبت کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ ہر قوم اپنے افراد کو اپنے فلسفہ کی تعلیم دینا اپنا فرض اولین شمار کرتی ہے خواہ نصب العین کسی نوعیت کا ہو لیکن جب ایک نظام تعلیم کو اس کے مطابق ٹھیک طرح سے ڈھالا جائے تو ہم اس کی مدد سے ایک قوم کو یقینی طور پر اپنے نصب العین کی محبت سے سرشار کر سکتے ہیں۔ ہٹلر، مسولینی اور لینن میں سے ہر ایک نے طاقت سنبھالنے کے بعد جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ قوم کے نظام تعلیم کو بدل کر اپنے اپنے نصب العین کے مطابق بنا لیا تھا اور اسی طرح گزشتہ جنگ عظیم کے بعد جرمنی اور جاپان کے فاتحین نے بھی ملک میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا تھا کہ نصاب تعلیم کو بدل کر اپنے فلسفہ

دوسری قوموں کی مثالیں

کے مطابق کر لیا تھا۔ روس میں فلسفۂ اشتراکیت کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں چیکوسلواکیہ کی حکومت نے ایک حکم نافذ کیا ہے کہ ہر افسر کو ملازمت میں داخل ہونے سے پہلے ایک امتحان دینا ہوگا جس میں اور مضامین کے علاوہ فلسفۂ اشتراکیت بھی ہے جو افسر فلسفۂ اشتراکیت میں فیل ہو جائے (اور ہمیں معلوم ہے کہ جدلی مادیات یعنی فلسفۂ اشتراکیت دنیا کے مشکل ترین فلسفوں میں سے ہے) وہ تمام مضامین میں فیل سمجھا جاتا ہے۔ اسے ٹیکسٹ بک آف مارکسسٹ فلاسفی A Text-Book of Marxist Philos کے مصنفین فلسفۂ اشتراکیت کی عام تعلیم کی اہمیت جتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک روسی جانتا ہے کہ ایک آدمی کا فلسفہ اہمیت رکھتا ہے کہ ہم سماج کی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ اپنے سیاسی اور صنعتی اقدامات کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ فلسفہ کی تردید اور اس کے عوض میں نئے فلسفہ کی

تردید اور اس کے عوض میں نئے فلسفہ کی تبلیغ نہ کریں۔ وہ جس نظام تصورات کی تردید کرتے ہیں اس کے نقائص کو خوب جانتے ہیں۔ اور ان کے پاس اپنا ہی ایک الگ نظام تصورات ہے جو ہر چیز کے دیکھنے کے لیے انہیں روشنی بخشتا ہے ایک روسی چیسٹرین Chesterton کے ساتھ اتفاق رکھتا ہے کہ انسان کے بارے میں اہم ترین چیز اس کا نظریہ کائنات ہے۔ تاریخ میں کوئی تحریک ایسی پیدا نہیں ہوئی جو اصل میں ایک فلسفیانہ تحریک نہ تھی بڑے بڑے فلسفوں کے ظہور کا وقت بڑے بڑے نتائج کے ظہور کا وقت تھا لہٰذا یقیناً کسی شخص کے لیے ممکن نہیں کہ اپنے ذہن کو فلسفہ سے خالی رکھے جو شخص کہتا ہے کہ وہ فلسفی نہیں وہ درحقیقت یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ اچھا فلسفی نہیں۔"

ہر شخص جو جرمنی اور روس کے ان حالات سے جو ہٹلر اور لینن کے لائے ہوئے انقلابات سے پہلے اور بعد میں ان ملکوں میں پیدا ہوئے تھے واقف ہے خوب جانتا ہے کہ کس طرح تعلیم کے جادو نے لوگوں کو ان کے نظریات کا فریفتہ بنا دیا جن سے وہ پہلے خود متنفر تھے۔ جب تعلیم کے ذریعے سے ہم انسانوں کے دلوں میں ایک غلط نصب العین کی شدید محبت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں، حالانکہ غلط نصب العین انسان کی فطرت کے مطابق نہیں ہوتا تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ مناسب تعلیم کے ذریعہ سے صحیح اور فطرتی نصب العین کی محبت کس درجہ تک پیدا کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک مسلمان طلباء کا تعلق ہے پاکستان کے نظام تعلیم میں عربی، انگریزی اور فلسفۂ خودی (جس میں قرآن اور حدیث بھی شامل ہیں) کو

ہمارے نظام تعلیم کے ضروری عناصر

لازمی مضامین کا درجہ ملنا چاہیئے۔ عربی کو اس لیے کہ وہ قرآن اور حدیث کی زبان ہے۔ فلسفۂ خودی کو اس لیے کہ وہ قرآن اور حدیث کی ایک ایسی تفسیر ہے جو ارتقائے علم کے موجودہ دور کے مطابق ہے اور انگریزی کو اس لیے کہ وہ قریباً قریباً دنیا کی مشترکہ زبان Lingua Franca کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بغیر ہم علم کی ترقیوں سے ہمدوش ہو سکتے ہیں نہ دوسروں کی

بات سمجھ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو اپنی بات سمجھا سکتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا منصب اقوامِ عالم کی امامت کا منصب ہے جو یہ چاہتا ہے کہ ہم دوسروں کو اپنی بات سمجھائیں اور ان کی بات سمجھیں۔ فلسفۂ خودی کی مکمل واقفیت کے لیے ایک ایسی ذہنی تربیت کی بھی ضرورت ہے جو سائنس اور فلسفہ کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا سائنس بھی کچھ اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ وہ ہماری اقتصادی اور فوجی ضروریات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتی ہے ہمارے نصابِ تعلیم میں ایک خاص اہمیت رکھے گی۔ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے زمانے میں علمائے دین وہی لوگ شمار ہوں گے جو قرآن اور حدیث کی واقفیت کے علاوہ فلسفۂ خودی کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں اور نیز دین کے سمجھنے کے لیے ایک خاص روحانی استعداد کا ثبوت بہم پہنچائیں گے۔ اس زمانہ میں ایسے علماء کثرت سے پیدا ہوں گے۔

تاہم جس طرح سے اسلام کے پہلے دور میں یہ ضروری نہیں تھا کہ ہر شخص قرآن اور حدیث کا بڑا عالم بن جائے۔ اب بھی یہ ضروری نہیں ہوگا کہ ہماری قوم کا ہر فرد فلسفۂ خودی کا ماہر بن جائے۔ ہر قوم کے ذہین ترین لوگ دوسروں کی راہنمائی کیا کرتے ہیں اور یہ کافی ہے کہ ہماری قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہین ترین افراد فلسفۂ خودی کے ماہر ہوں اور ایسے لوگوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی رہے گی۔ مارکسزم Marxism دنیا میں پھیل رہی ہے۔ اگرچہ وہ لوگ جو فلسفۂ اشتراکیت سے پوری طرح واقف ہیں زیادہ سے زیادہ ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ ان لوگوں کا اثر بالواسطہ عوام پر پڑتا ہے اور انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اشتراکیت کے انقلاب کا باعث روٹی کا نعرہ نہیں بلکہ اس کا باعث یہ ہے کہ دنیا کے ذہین ترین لوگ علمی نقطۂ نظر سے فلسفۂ اشتراکیت کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔ روٹی کا نعرہ اور اس کا اثر اسی قلب ذہنیت کی پیداوار ہے۔

عوام تعلیمیافتہ طبقہ کے پیچھے چلتے ہیں

ہم اپنے استحکام کے لیے بجٹ کا بہت سا حصہ فوجی مصارف کے لیے وقف کرنے پر مجبور ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں ہر قوم کے لیے ذہنی محاذ Intellectual Front

فوجی محاذ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جب تک کہ کوئی قوم اپنے آپ کو ذہنی محاذ پر حملہ اور حفاظت Offence & Defence کے قابل نہ بنائے وہ محض فوجی طاقت سے اپنی آزادی کو قائم نہیں رکھ سکتی اور اگر وہ ذہنی محاذ پر طاقت ور ہوگی تو اس کی فوجی طاقت قومی حفاظت کے لیے وہ چند زیادہ موثر ثابت ہوگی۔ اس

ذہنی محاذ فوجی محاذ سے بھی زیادہ اہم ہے

زمانہ میں یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے مشاہدہ میں آگئی ہے کہ نظام ہائے تصورات خواہ وہ پست ہوں یا بلند، کمزور ہوں یا طاقتور ایک دوسرے کے ساتھ ایک زندگی اور موت کی کشمکش میں مصروف ہیں جو اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک کہ ایک نظام تصورات یا خود نہ مٹ جائے یا دوسرے نظام ہائے تصورات کو مٹا نہ دے۔ اگرچہ اس کشمکش کے دوران میں فوجی طاقت اور خونریزی کا استعمال ایک نہ ایک مقام پر ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن نظام ہائے تصورات کا اصل مدعا تشدد اور خونریزی نہیں بلکہ فقط یہ ہے کہ ہر ممکن طریق سے خواہ وہ طریق صلح کا ہو یا جنگ کا۔ اپنے ماننے والوں یا ہمدردوں کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔ گویا ہر نظام تصورات دوسرے نظام ہائے تصورات پر ذہنی فتح حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے تبلیغ (پراپیگنڈہ) کے تمام ذرائع کام میں لاتا ہے۔ ذہنی فتح، سیاسی فتح کا پیش خیمہ ہے اور خونریزی اور فوجی فتح کی غرض و غایت یہ ہے کہ ذہنی فتح کے لیے راستہ صاف کیا جائے۔ پہلے ایک جزوی ذہنی شکست فوجی شکست کے لیے راستہ صاف کرتی ہے اور پھر فوجی شکست کے بعد ذہنی شکست مکمل کر لی جاتی ہے۔

جو قوم ذہنی محاذ پر جارحانہ اقدام کر کے دوسری قوموں کو ذہنی طور پر فتح نہیں کرتی وہ خود ذہنی طور پر اور لہٰذا آخر کار سیاسی طور پر مفتوح و مغلوب ہونے کا خطرہ مول لیتی ہے۔ ہماری غلامی کا اولین سبب ہماری ذہنی شکست تھی۔ اور ہمارا موجودہ انحطاط سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم ذہنی طور پر مغلوب ہو چکے ہیں۔ فوجی اور ذہنی دونوں محاذوں کی صورت میں یہ بالکل درست ہے کہ جارحانہ اقدام Offence بہترین قسم کی مدافعت Defence ہے۔ اگر ہم دوسروں پر حملہ میں پہل نہ کریں گے تو خواہ ہم فوجی محاذ پر لڑ رہے ہوں یا ذہنی محاذ پر ہم مدافعت کے قابل نہیں ہو سکیں گے

ایک اسلامی ریاست کے بنیادی نظریہ کی حیثیت سے فلسفہ خودی کی اہمیت کا سب سے بڑا نکتہ یہی ہے کہ فلسفۂ خودی وہ حربہ ہے جس سے اسلام اس دور میں ذہنی محاذ پر دوسری قوموں کے خلاف حملہ میں پہل کر کے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں فلسفۂ خودی کے بغیر غیروں میں اسلامی تصورات کی تبلیغ قریباً قریباً ناممکن ہے شروع میں تبلیغ اسلام کے لیے ہمارا طریقہ یہ تھا کہ ہم اسلام کو مجموعی حیثیت سے پیش کر کے فطرت انسانی کو اپیل کرتے تھے یہ طریقہ اس وقت تک تو خوب کامیاب رہا جب تک

فلسفۂ خودی ہماری طاقت کا منبع اور آزادی کا محافظ ہے

تبلیغ اسلام کا طریقہ بدلنے کی ضرورت

ایک طرف انسان ابھی تک سادہ لوح تھا اور دوسری طرف صحابہ کرام اور صوفیائے عظام ایسی بڑی بڑی روحانی شخصیتیں اس سے کام لینے کے لیے ہم میں موجود تھیں اس کے بعد جب شدید مذہبی تعصبات کا زمانہ شروع ہوا تو ہم نے مذہبی مناظروں کے ذریعے سے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ لیکن آج ہم اسلام کی تبلیغ کے لیے نہ پہلی راہ اختیار کر سکتے ہیں اور نہ دوسری کیونکہ آج ہمارا مخاطب پہلے زمانہ کا سادہ لوح انسان نہیں بلکہ اس زمانہ کا وہ انسان ہے جس کی فطرت غلط فلسفوں سے پوری طرح مسخ ہو چکی ہے اور پھر آج ہمارا مدِّمقابل کوئی مذہب نہیں بلکہ قوموں کے پیچیدہ فلسفے اور نام نہاد دہریت عقلی نظریات ہیں۔ اس زمانہ میں جہاں دہریت، الحاد اور الحاد کے دُور دُورہ کی وجہ سے ہم میں بڑی بڑی روحانی شخصیتیں پیدا نہیں ہوتیں وہاں دوسری طرف فلسفی، مؤرخ، ماہر نفسیات اور ماہر اجتماعیات نے انسان کو ایسا سبق دیا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہو کر خدا اور مذہب کے تصورات کا نکتہ چیں اور مُنکر بن گیا ہے اور ان کا ذکر تک کرنا گوارا نہیں کرتا۔ موڈرن اسلام اِن انڈیا Modern Islam in India کے مصنف پروفیسر سمتھ نے جو ہماری مذہبی سرگرمیوں کا استخفاف کیا ہے وہ ایک شخص کی رائے نہیں بلکہ دورِ حاضر کے انسان کی قائم مقام رائے ہے اور پروفیسر سمتھ ہمارے مبلغین کو مشورہ دیتے ہوئے بالکل سچ کہتا ہے:

"جہاں دس بیس سال پہلے بازاروں کے موڑوں پر مذہبی مناظرے ہوا کرتے

تھے اور تعلیمیافتہ مسلمان عصر جدید کے متعلق کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنا سر کھپاتے تھے۔ آج مسلمان نوجوان ان علمی مشکلات سے بے خبر اور بے پرواہ ہے جو زندگی کے صحیح راستہ کی حیثیت سے مذہب کے سامنے آتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سے آزاد خیال مسلمانوں نے ان اعتراضات کا قریباً قریباً مکمل جواب دیا جو عیسائیوں نے اسلام پر وارد کیے تھے۔ آج ترقی پسند مسلمان اس جواب کو کافی سمجھتا ہے اور کوئی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوتا جو جواب دینا تو درکنار ان اعتراضات کا فقط ذکر ہی کرے جو اس زمانہ میں فلسفی، مؤرخ، ماہر نفسیات اور ماہر اجتماعیات نے اسلام پر اور سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں۔"

Modern Islam in India

آج ہم وعظوں یا مناظروں سے اسلام کی تبلیغ نہیں کر سکتے بلکہ ٹھوس علمی حقائق کو سامنے لانے سے اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ آج ہمارا بڑے سے بڑا عالم دین بھی اگر غیروں کے سامنے اسلام کو اسی طرح عقائد اور اعمال کے ایک سادہ سے مجموعہ کے طور پر پیش کرے جس طرح سے وہ پہلے کیا کرتا تھا تو اس کی دعوت کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس دلوں میں نفرت بڑھ جاتی ہے لہٰذا اس زمانہ میں اسلام کی تبلیغ کو جاری رکھنے کے لیے قدرت نے اسلام کو ایک ایسے عقلی نظام افکار کی صورت دے دی ہے جو ٹھوس علمی حقائق پر مبنی ہے۔ جو نہ صرف ان اعتراضات کو" جو اس زمانہ میں فلسفی مؤرخ، ماہر نفسیات اور ماہر اجتماعیات نے اسلام اور سارے مذہب پر وارد کر رکھے ہیں۔ بیہودہ ثابت کرتا ہے بلکہ جس میں ایک تصور دوسرے تمام تصورات کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اب ہمارے لیے ممکن ہو گیا ہے کہ ہم کسی ایک تصور کو لے لیں جس سے مخالفین متفق ہوں اور پھر اس سے ان کو باقی ماندہ تمام اسلامی تصورات کی طرف راہنمائی کریں چونکہ ایک عقلی نظام تصورات کی تبلیغ کرتے ہوئے معلوم تصورات نامعلوم تصورات کی طرف راستہ بالکل صاف ہوتا ہے ہم اس قسم کے نظام تصورات کی تبلیغ میں ایک مؤثر عقلی ترتیب اور تدریج اختیار کر سکتے ہیں مثلاً

فلسفۂ خودی کا ایک تصوّر یہ ہے کہ ہر قوم اور فرد کو اخلاق کے عالمگیر اصولوں پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور دنیا کم از کم نظری اعتبار سے اس پر پوری طرح متفق ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کی رائے عامہ میں اب بھی ایک ایسی طاقت ہے جس سے دنیا کی قومیں خوفزدہ ہوتی ہیں اور ہر قوم اس کا کوئی فعل اچھا ہو یا بُرا، اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ اپنے فعل کو اخلاقی طور پر درست اور اپنی مقابل قوم کے فعل کو اخلاقی طور پر غلط ثابت کرے۔ اگرچہ ابھی تک قومیں اس عقیدہ پر عمل نہیں کر سکیں لیکن مذہب کے ختم ہونے کے بعد مذہب کے اس عقیدہ کا نظری طور پر ہی زندہ رہ جانا اور مرنے کا نام نہ لینا بلکہ دن بدن اور طاقتور ہوتے جانا نوع انسانی کے مستقبل کے لیے ایک امید کی شعاع ہے کیونکہ یہ عقیدہ انسان کو سائنس اور فلسفہ کی راہ سے اسلام کی طرف لائے گا۔ اور یہ کام فلسفۂ خودی کے ذریعے سے انجام پائے گا کیونکہ یہی وہ فلسفہ ہے جو ناقابل تردید

اس زمانہ میں فلسفۂ خودی کے بغیر تبلیغ اسلام ممکن نہیں

شواہد اور دلائل کی بناء پر ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے کی خواہش کشش نصب العین کا ایک حصہ ہے اور کس طرح سے اس خواہش کی تکمیل کامل نصب العین کی شدید محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اب اس عقیدہ کو عملی صورت دینے کی کوشش کرے گا تو اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہے گا کہ وہ اس کی خاطر پہلے تمام اسلامی تصوّرات کو قبول کرے۔

اگر ہم فلسفۂ خودی کو ریاست کی بنیاد نہ بنائیں تو چونکہ ہم ذہنی محاذ پر کمزور رہیں گے، ہمارے لیے مشکل ہوگا کہ اس زمانہ میں اپنی آزادی کی حفاظت کر سکیں۔ نیز ہم اس مقصد کو بھی نقصان پہنچائیں گے جس کے پیش نظر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں، یعنی تبلیغ اسلام اور دنیا کی راہ نمائی اور نجات دہی کا مقصد۔ اور دوسری طرف اگر ہم نے فلسفۂ خودی کو پاکستان کی بنیاد نہ بنایا تو باطل تصوّرات کے خلاف اسلام کا ردِّ عمل اپنے کمال کو کیونکر پہنچے گا اور دائرہ اسلام کے اندر اور باہر ان تصوّرات کا استیصال کیونکر ہوگا گویا ہم جس پہلو سے دیکھیں

ہمیں نظر آتا ہے کہ پاکستان اور فلسفۂ خودی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آغوش ہو کر ایک دوسرے کی زندگی اور ترقی کا ذریعہ بننے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ اس وقت دنیا اپنی مصیبتوں سے پریشان ہے اور ان سے مستقل نجات کی راہ ڈھونڈ رہی ہے لیکن اس کے پاس فلسفۂ خودی کے سوائے کوئی اور راہ نجات نہیں۔ فلسفۂ خودی کی نوعیت اور اس وقت دنیا کی ذہنی کیفیت دونوں اس بات کے ضامن ہیں کہ دائرۂ اسلام سے باہر ہمیں اپنی تبلیغ میں بہت کامیابی ہوگی اور کچھ عرصہ کے بعد دنیا کے ہر ملک میں ہمارے ماننے والوں اور ہمدردوں کی جماعتیں پیدا ہو جائیں گی جو رفتہ رفتہ بڑھتی رہیں گی اور ہماری حوصلہ افزائی سے زیادہ طاقتور ہوتی جائیں گی۔ یہ صورت حالات ایک عالمگیر اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ہوگی۔ ہم تمام ایسی قوتوں کو جو سچے دل سے دنیا کے امن اور اتحاد کی متمنی ہیں اور امن و اتحاد کے نام کو اپنے سامراجی مقاصد کی پیش بُرد کے لیے کام میں لانا نہیں چاہتیں، فلسفۂ خودی کی طرف دعوت دیں گے تاکہ وہ ہمارے ساتھ مل کر امن و اتحاد عالم کے لیے کام کریں۔ پھر ہماری دعوت اس نوعیت کی ہوگی کہ جو قوم اسے تعصب اور ہٹ دھرمی کی بنا پر قبول نہ کرے گی، وہ اس کا خمیازہ یوں بھگتے گی کہ انکار کے ساتھ اس کے اندر ایک اخلاقی ضعف اور احساسِ کمتری پیدا ہو جائے گا جو آخر کار اس کی شکست کا موجب ہوگا۔ ہندو قوم فلسفہ اور روحانیت سے ایک تاریخی نسبت رکھتی ہے اور لہٰذا ہمیں اس سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے لیکن اگر وہ ہماری دعوت کو قبول نہ کریں گے تو اپنے ماضی کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اخلاقی طور پر دوسری قوموں سے زیادہ نقصان میں رہیں گے اور ہر حالت میں ہم یقین کر سکتے ہیں کہ پاکستان کے اندر اور باہر ہندو قوم کا ایک مقتدر طبقہ اپنی روایات کی وجہ سے ہمارے نظام تصورات کے ساتھ ہمدردی پیدا کرے گا۔ عیسائیوں کی صورت میں بھی جو ہماری دوسری بڑی اقلیت ہیں یہ توقعات قریباً قریباً درست ہیں۔ ہر مذہب کو ماننے والے اپنے مذہب کی

اس وقت فلسفۂ خودی کی اشاعت کے لیے حالات سازگار ہیں

سچے تصورات کا بے پناہ اثر

علمی اور عقلی توجیہ چاہتے ہیں جو ان کو فلسفۂ خودی بہم پہنچاتا ہے۔

تاہم ہمارا راستہ شروع سے ہی آسان نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمیں پاکستان کے اندر اور باہر

ایک بیرونی مشکل

اپنی تبلیغ میں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دنیا خواہ اس وقت فلسفۂ خودی کی کتنی ہی ضرورت محسوس کر رہی ہو لیکن جب فلسفۂ خودی فی الواقع ان کے سامنے آئے گا تو ہر قوم کا پہلا ردِ عمل نفرت کا ہوگا کیونکہ اس وقت انہیں گمان تک نہیں کہ دنیا کا آئندہ نجات دہندہ علمی اور عقلی مذہب Scientific religious مسلمانوں کی طرف سے آئے گا۔ لہٰذا انہیں قومی تعصب ابتداء میں مخالفت پر مجبور کرے گا۔ اور یہ بات ہمیں نظریہ کی اشاعت میں مزید جانفشانیاں کرنے کے لیے اور اسے زیادہ بہتر طریق سے پیش کرنے کے لیے اکسائے گی کسی بات کا تسلیم کیا جانا فقط اس کی معقولیت اور سچائی پر منحصر نہیں بلکہ اور بہت سی باتوں پر موقوف ہے۔ انسان فطرتاً راسخ العقیدہ واقع ہوا ہے اور جس عقیدہ پر وہ جم جاتا ہے خواہ اچھا ہو یا بُرا، معقول ہو یا غیر معقول اسے آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ اصل میں انسان کی یہ ہٹ دھرمی اس لیے ہے کہ جب وہ صداقت پر اپنا اعتقاد پیدا کرے تو باطل کے معمولی حملوں سے پیچھے نہ ہٹ سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان باطل پر بھی اسی پختگی سے جم جاتا ہے جس کا اظہار فقط حق کے لیے ہونا چاہیئے تھا۔ تاہم انسان کی فطرت کی یہ پہلو حق کو موقع دیتا ہے کہ وہ باطل پر فتح پانے کے لیے اور زیادہ کشمکش کرے اور اس سے حق اور طاقتور ہوتا ہے اور دنیا میں اور ظہور پاتا ہے لہٰذا زود یا بدیر ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے پڑیں گے جن میں ہٹ دھرمی قائم نہیں رہتی تاہم دنیا کے سمجھدار، ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک کثیر تعداد کو صرف تعلیم اور تبلیغ کے ذریعہ سے اپنا طرفدار بنا لینا دوسری قوموں کی نسبت ہمارے لیے زیادہ آسان ہوگا کیونکہ ہمارا نظریۂ زندگی معقول اور مدلل ہے اور انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ہمیں ہر حالت میں مطمئن رہنا چاہیے مگر غیر قوموں میں فلسفۂ خودی کی نشر و اشاعت میں ہمیں آخر کار بے نظیر کامیابی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفۂ خودی کو زیادہ عرصہ کے لیے

نظر انداز کرنا اقوامِ عالم کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ فلسفہ خودی ارتقاء کے راستہ کی ایک ضروری منزل ہے اور نوعِ انسانی اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ اس سے ہو کر گزرے۔ وہ اسے دائیں یا بائیں چھوڑ کر قطعاً آگے نہیں جا سکتی۔ البتہ ہم اپنی تبلیغ سے انسان کی اس منزل کو قریب تر لا سکتے ہیں اور اس کی پریشانیوں کے عرصہ کو مختصر کر سکتے ہیں۔

ایک اندرونی مشکل

علماء کا ذہین اور سمجھدار طبقہ اسلام کی صحیح بصیرت رکھتا ہے اور ہمارے انحطاط کے اسباب کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکتا ہے اور لہٰذا ان کا ازالہ کرنے کا خواہشمند ہے۔ وہ فلسفہ خودی کو لبیک کہے گا اور احیائے ملت کی خاطر اس کی تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے لیے سرگرم عمل ہو جائے گا لیکن ہم میں علماء کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو نہ تو اسلام کی صحیح بصیرت رکھتا ہے اور نہ قرآن کی اور نہ ہمارے انحطاط کے اسباب کو سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ علماء فلسفہ خودی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس کی مخالفت پر آمادہ ہوگا۔ لیکن ان کی مخالفت بے بنیاد ہونے کی وجہ سے ناکام رہے گی۔ علماء کے اس طبقہ کو اقبال بار بار مُلّا کے لفظ سے تعبیر کر کے اسے رمز دیں سے ناآشنا، اسرار کتاب سے نامحرم، فساد قلب و نظر، بے نور اور کور ذوق قرار دیتا ہے۔ قدرت نے بھی علماء کے اس طبقہ کو اسلام کی خدمت کا نااہل سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اور اس زمانہ میں اسلام کی ترقی کا دارومدار ان پر نہیں رکھا بلکہ ان مسلمانوں پر رکھا ہے جن کو یہ علماء مغرب زدہ اور گنہگار کہتے ہیں اور جن کے اعتقادات اگرچہ مغرب کے تصورات کے ساتھ ایک ناکام خاکی کشمکش میں مصروف ہیں لیکن جو پھر بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں اسلام کا درد لیے ہوئے ہیں چونکہ علماء کا یہ طبقہ اس دور میں احیائے ملت کے لیے ایک رکاوٹ تھا اور متواتر ایک رکاوٹ بنا رہتا اس لیے قدرت نے ان کو الگ کر کے احیائے اسلام کے مقاصد کی پیش بُرد کے لیے مغرب زدہ گنہگار مسلمانوں سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ایک دوسرے کی تکفیر میں لگے ہوئے تھے ایک گنہگار اسلام کے غم میں شب و روز خونِ جگر پی رہا تھا اور شعر کے پیرایہ میں ایک ایسا لٹریچر پیدا کر رہا تھا جو بالآخر اسلام کے سب سے بڑے دشمن یعنی فلسفۂ مغرب کی یلغار کو تھام لینے والا تھا۔ تاہم یہ شخص

ان کی تکفیر سے بچ نہ سکا۔ اور پھر جب یہ لوگ قرآن کو ہاتھ میں لیے ہوئے برعظیم ہند کے سارے مسلمانوں کو ہندو کی غلامی پر رضامند کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور ایک مغرب زدہ مسلمان اس غم میں بے قرار تھا کہ مسلمان آزاد ہوں تاکہ اپنے دین و ایمان اور اپنے کلچر اور تمدن کی حفاظت کر سکیں۔ اگر پاکستان ان لوگوں کی کوششوں سے وجود میں آتا اور یہ لوگ اس میں برسر اقتدار ہوتے تو آج دنیا میں فلسفہ خودی کی نشر و اشاعت کی ترقعات بے معنی ہوتیں اور خود پاکستان کے ظہور کا مقصد فوت ہو جاتا۔ لیکن قدرت نے بڑے اہتمام کے ساتھ ہر قدم پر ان لوگوں کو اس راستہ سے جو اقتدار کی طرف جاتا تھا۔ باز رکھا ہے اور اس طرح فلسفہ خودی کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ پاکستان کے بیاسی نظریہ کے طور پر وجود میں آئے تاکہ اسلام کا قدرتی ردِ عمل اپنے کمال کو پہنچے۔ اس دور میں جس طرح سے قدرت نے آج تک عالم دینداروں کو چھوڑ کر اسلام کی خدمت کے لیے ایسے لوگوں کو چنا ہے جو ان کی نظروں میں جاہل اور گنہگار رہیں، کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ بھی گناہ کا سدباب کرنے کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے میں خداوند تعالیٰ کی حکمت پھر گنہگاروں سے ہی کام لے۔ "مغرب زدہ" مسلمان قرآن کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھتے لیکن زمانہ کو سمجھتے ہیں، لہٰذا اس دور میں اسلام کی خدمت کے لیے کم از کم ان علماء سے زیادہ موزوں ہیں اور پھر فلسفہ خودی ان کے فہم و یقین کے لیے علاج ثانی کا حکم رکھتا ہے۔ ضروری ہے کہ اسلام کے لیے ترقی کی راہ پا کر یا امید کی کرن دیکھ کر یہ لوگ اسلام کے لیے ہمہ تن خدمت بن جائیں اور اسلام کی نئی زندگی کے لیے کام کرنے لگ جائیں۔ اگر علماء کے بے بصیرت طبقہ نے پھر ہمارے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تو ہمارا فرض ہوگا کہ ان کو ایک مضبوط ہاتھ سے دبا دیں۔

علماء کا بے بصیرت گروہ

ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ ایک اسلامی ریاست کو چلانے کے لیے ہمیں بڑے بڑے پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کی ضرورت ہے جو اس وقت میسر نہیں آ سکتے۔ اور لہٰذا وہ ایک اسلامی ریاست کے طور پر پاکستان کی کامیابی سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

ہمیں شروع میں صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ جس طرح سے دوسری قومیں اپنے اپنے نصب العین کی صحت اور عمدگی کا نصب العین کو ٹھیک طرح سے سمجھتی ہیں، ہم اپنے نصب العین

عالمانہ یقین ہماری پہلی ضرورت ہے

یعنی اسلام کو ٹھیک طرح سے سمجھیں اور اس کی درستی اور پختگی پر پورا پورا یقین رکھیں اور اس زمانہ میں ہم یہ فہم و یقین فلسفۂ خودی کے مطالعہ سے پیدا کر سکتے ہیں۔ انسان میں نیکی اور بدی دونوں موجود ہیں۔ لیکن جونہی ایک انسان نیکی کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیتا ہے وہ بدی کے ساتھ ایک کشمکش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد گو وہ بار بار پھسلتا رہے لیکن بلحاظ کُل اس کی نیکی کی قوت بڑھتی اور بدی کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ ایک اسلامی ریاست کا یہ نشان نہیں کہ اس کے لوگ شروع ہی سے ارتقائے خودی کی انتہائی سطح پر ہوتے ہیں بلکہ ایک اسلامی ریاست کا نشان یہ ہے کہ نیکی اور بدی کی اس کشمکش میں جو اس کا فرد خود اپنی مرضی اور اختیار سے اپنے دل میں پیدا کرتا ہے، اسلامی ریاست (اس کی فطرت کی کمزوریوں کے خلاف اور اس کی فطرت کی نیکی کے حق میں) اس کی مدد کو پہنچتی ہے اور اسے اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے میں سہولتیں مہیا کر کے اس کی کوشش کو آسان کرتی ہے۔ ایک فرد انسانی کی فطرت اگر صحیح اور صالح صورت میں باقی رہے تو نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعہ سے (اور میں تعلیم کا لفظ یہاں

اسلامی ریاست کا کام

وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) اس فطرت کو بگڑنے نہیں دیتی بلکہ اُسے قائم رکھتی ہے اور اسے مزید رونق اور جلا دیتی ہے۔ یعنی ایسا ماحول پیدا کرتی ہے جس میں بدی کے لیے فرد کی فطرتی نفرت اور نیکی کے لیے اس کی فطرتی محبت میں متواتر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور پھر جس حد تک ضروری ہوتا ہے ایک اسلامی ریاست فرد کی اعانت اور حفاظت کے لیے اس کی بدی کو جبراً روک دیتی ہے تاکہ وہ اس پر یعنی اس کی نیکی پر غالب نہ آئے۔ افسوس کہ آزادی اور جمہوریت کے تصورات کی غلط ترجمانی کی وجہ سے جو اس زمانہ میں عام ہے اس قسم کے جبر کی ماہیت کے بارہ میں ہم میں سے بعض غلط فہمی کا شکار ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس

قسم کا جبر فرد کی آزادی کو سلب کرتا ہے، لیکن درحقیقت یہ جبر فرد کی آزادی کو سلب نہیں کرتا بلکہ اسے اور آزاد ہونے کا موقع دیتا ہے اور اس کے خلاف نہیں بلکہ اس کے حق میں آتا ہے کیونکہ اس کی کوشش کو آسان کر کے اس کے لیے اطمینان اور تسلی کا سامان بہم پہنچاتا ہے جس طرح سے ایک جماعت میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی اور دونوں کی باہمی کشمکش اور مخالفت میں ریاست کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جماعت کی حفاظت کی خاطر جبر سے کام لے کر اس کو نیکوں کو بُروں سے محفوظ رکھے، اسی طرح سے ایک فرد کے شعور کے اندر اچھی اور بُری خواہشات ہوتی ہیں۔ جو ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش کرتی ہیں اور ریاست کا فرض ہے کہ اس کشمکش میں فرد کا ساتھ دے یعنی اس کی نیکی کو جبراً اس کی بدی سے محفوظ رکھے تاہم جبر کا استعمال احتیاط کے ساتھ اور واضح ضرورت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔

جس طرح سے پاکستان ایک شخص کے مطالبہ کے بعد محض عدم سے وجود میں آیا ہے حالانکہ نہ ہم میں اس کا واضح تصور تھا نہ اس کے حصول کی ہمت تھی اور نہ اس کے لیے ضروری تنظیم تھی نہ دولت، اسی طرح سے ہماری اخلاقی حالت اسلام کو اپنا نصب العین مقرر کرنے کے بعد انتہائی پستی سے انتہائی بلندی تک پہنچے گی حالانکہ اس وقت ہمیں بظاہر اس کے کوئی اسباب نظر نہیں آتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر مقصد کی تکمیل کے اسباب مقصد کے اندر ہی موجود ہوتے ہیں۔ جب ہم ایک مقصد کو اپنا لیتے ہیں اور پھر اپنے عزم کو پکا کر لیتے ہیں تو یہ اسباب اس کے اندر سے خود بخود نکلتے آتے ہیں۔

نصب العین کا یقین تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اندرونی کشمکش مسلمان کے ساتھ خاص ہے بلکہ ہر فرد انسانی جو ایک نصب العین رکھتا ہے اس کشمکش میں گرفتار ہے کیونکہ ہر نصب العین کی اپنی الگ نیکی اور بدی ہوتی ہے اور جو شخص کسی نصب العین کی جستجو کرتا ہے وہ اس کی نیکی کی طرف بڑھنے اور اس کی بدی سے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ کوئی انسان ایسا نہیں جو کسی نہ کسی نصب العین سے وابستہ نہ ہو، یہ کشمکش ہر انسان کا حصہ ہے۔ زندگی بھر میں فکر و عمل کے لیے ہمارے تمام فیصلے اسی کا

نتیجہ ہیں۔ یہی زندگی کی جدوجہد ہے۔ اسی سے دنیا کی رونق اور زینت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی زندگی بے کیف ہو جاتی ہے پھر یہ کشمکش انسان کے لیے مصیبت نہیں بلکہ ایک راحت ہے۔ انسان اس میں لذت محسوس کرتا ہے اور یہ لذت اسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے کوئی انسان

اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کا فرق

اپنے نصب العین سے محبت رکھتا ہو۔ پھر یہ ایک اسلامی ریاست ہی نہیں جو نصب العین کی جستجو میں فرد کی اعانت کرتی ہے بلکہ ہر ریاست کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اور فرد کے مشترک نصب العین کی جستجو میں فرد کی اعانت کرے اور ریاست کی ساری سرگرمیاں خواہ ان کی نوعیت فوجی ہو یا اقتصادی، مالی ہو یا تعلیمی یا کوئی اور اس غرض و غایت کے ماتحت ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست اور اس کے افراد کا نصب العین اور اس سے پیدا ہونے والا نیکی اور بدی کا معیار صحیح اور کامل ہوتا ہے اور غیر اسلامی ریاست اور اس کے افراد کا نصب العین اور اس سے اخذ کیا ہوا نیکی اور بدی کا معیار غلط اور ناقص ہوتا ہے۔

۶۔ صحت

مختصراً ہم نے زمانہ کے غلط تصورات کے خلاف اسلام کے قدرتی ردِ عمل کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا تو یہ ردِ عمل اپنے کمال کو پہنچے گا اور اس کے نتیجہ کے طور پر اسلام کو ایک نئی زندگی عطا ہوگی۔ اور لاتعداد برکات کا ظہور ہوگا جن میں سے اہم ترین یہ ہیں:۔

۱۔ مسلمانوں کا احساس کمتری احساس برتری میں بدل جائے گا اور اس کی وجہ سے ان کے اندر ایک حیرت انگیز قوتِ عمل پیدا ہوگی۔

۲۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کی معقولیت اور عظمت مسلمانوں کی توجہ کو اس طرح سے جذب کر لے گی کہ وہ اپنے اپنے فرقہ وارانہ تعصبات اور اختلافات کو بھول جائیں گے اور رفتہ رفتہ بالکل ترک کر دیں گے۔ تعلیم کی وجہ سے جوں جوں ان کی محبت نصب العین ترقی کرے گی ان

قومی اتحاد

کا باہمی اتحاد اور توافق اور تراحم بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ وہ جسدِ واحد

کی طرح بن جائیں گے۔

۳۔ نصب العین کی محبت کی ترقی کی وجہ سے مسلمانوں کی تمام اخلاقی کمزوریاں جو دراصل ضعف اخلاقی تربیت محبت سے پیدا ہوتی ہیں، مثلاً نسل پرستی، صوبہ پرستی، حقے بندی رشوت ستانی، بددیانتی، قومی بے حمیتی اور غداری وغیرہ جن کا ذکر میں نے مقالہ کے شروع میں کیا ہے دور ہو جائیں گی۔ ایک قوم کی تمام قوتوں کا سرچشمہ نصب العین کی محبت ہے۔ اسی سے اخلاقی قوت، اقتصادی قوت، سیاسی قوت، فوجی قوت اور قوت کی تمام قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔

۴۔ ہماری اندرونی اصلاح کی وجہ سے دنیا کی توجہ ہمارے نظام تصورات پر جم جائے گی اور اشاعت اسلام دنیا کے لوگ اس کی طرف ایک غیر شعوری کشش محسوس کریں گے۔ جس میں منظم تبلیغ Propaganda سے اور اضافہ ہو گا یہاں تک کہ دنیا کے ہر ملک کے نیک سرشت اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ہماری ہمدرد پارٹیاں قائم ہوں گی جو خود بخود ہمارے تصورات کی اشاعت کریں گے۔ اس سے دنیا میں ہماری عزت اور سیاسی قوت میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے گا۔

۵۔ ہم علم کے ساتھ پھر وہی شغف پیدا کر لیں گے جو ہمیں اسلام کے زریں دور میں حاصل تھا میدان عمل میں راہنمائی چونکہ ہم محسوس کریں گے کہ ہمارا نظریہ ایک علمی نظریہ ہے اور اس کی اشاعت کا دارومدار علم کی جستجو اور ترقی پر ہے، ہمارا علمی شغف اور انہماک اس قدر بڑھے گا کہ ہم پھر علم کے میدان میں دنیا کی راہنمائی کے اس مقام پر فائز ہوں گے جو ہمیں پہلے حاصل تھا۔ ہم علم کی جستجو کر کے فلسفہ خودی کو ہر آن کامل سے کامل تر کرتے چلے جائیں گے اور دنیا بھر کے سائنسدان دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہوں گے۔

۶ ہماری اخلاقی برتری کی وجہ سے دنیا کی قومیں ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گی، اور

میدانِ سیاست میں راہنمائی بین الاقوامی انجمنوں میں ہماری رائے کو وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا چونکہ ہمارے پاس فطرتِ انسانی کا وہ علم ہوگا جو فی الواقع ایک دائمی امن اور اتحاد کی کنجی ہے اور جس کے بغیر امن اور اتحادِ عالم کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اس قابل ہوں گے کہ سیاست کے میدان میں دنیا کی راہنمائی کریں اور ہماری راہنمائی کی ضرورت دن بدن زیادہ محسوس کی جائے گی۔

۷۔ رفتہ رفتہ دنیا کی تمام قومیں اسلام کے بنیادی تصورات کی سچائی کو قبول کرلیں گے اور بالآخر کار اسلام کی آخری فتح سے کلیتہً اسلام میں داخل ہوجائیں گی۔ ایک نظریۂ زندگی پر اقوامِ عالم **اور آدم کا عروج** کا اتحاد لازمی طور پر ایک عالمگیر ریاست پیدا کرے گا اور چونکہ پاکستان فلسفۂ خودی کی تحریک کا مرکز ہوگا پاکستان اس ریاستِ عالم کا مرکز بھی ہوگا۔ اس عالمگیر ریاست میں سازگار حالات کی وجہ سے انسان اپنی محبت کو ترقی دے کر اپنی خودی کو کمال کے اس درجہ پر پہنچائے گا کہ نوعِ انسانی تنِ واحد کی طرح متحد ہوجائے گی۔ اس وقت دنیا میں ایک بے نظیر امن و امان اور اتحاد کا دور دورہ ہوگا۔ اور کرۂ ارض کا انسان چین کی زندگی بسر کرے گا لیکن اسے پھر بھی چین نہیں ہوگا اور وہ اپنی فطرت سے مجبور کائنات کی فضا میں نئی نئی مہمات کی تلاش میں نکلے گا۔ ارتقاء کی یہ منزل خیالی نہیں۔ بلکہ انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اور انسان اسے ضرور پاکر رہے گا اور کوئی مانے یا نہ مانے لیکن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمت اس منزل کی راہنما ہے۔

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات ۝

ڈاکٹر محمد رفیع الدین یکم جنوری ۱۹۰۴ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب آئیڈیالوجی آف دی فیوچر لکھی جس پر ۱۹۴۹ء میں آپ کو فلسفہ کے مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ ۱۹۵۳ء میں آپ کراچی میں اقبال اکیڈمی کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور وہیں سے ۱۹۶۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ اسی سال آپ کی ایک اور کتاب فرسٹ پرنسپلز آف ایجوکیشن پر پنجاب یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری دی۔ ۱۹۶۶ء میں آپ نے اسلامک ایجوکیشن کانگریس (بعد ازاں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس) کی بنیاد رکھی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۹ء میں کراچی میں آپ ٹریفک کے ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ آپ نے اپنی زندگی میں کئی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں جن کے حوالے سے آپ اپنی زندگی میں ہی عالم گیر شہرت کے مالک تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر سید ظفرالحسن آپ کی دینی اور علمی خدمات کے قدردان تھے۔ غیر مسلم فلاسفر مثلاً" ڈاکٹر رادھا کرشنن، پروفیسر لٹی اور وارن سٹین کرس بھی آپ کے علمی کارناموں کے معترف تھے اور انہیں مارٹن لوتھر کنگ اور ای۔ ایس برائٹ مین کے پائے کا فلسفی تسلیم کرتے تھے۔

Allama Muhammad Iqbal's *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*[23] and M. Rafi-Ud-Din's *Ideology of the Future*[24] are two of the most neglected works of modern Muslim scholarship. Both authors were years ahead of their time and have produced books which constitute the backbone of the Muslim reconstructive literature on the future. This literature derives its inspiration from the celebrated work of al-Ghazzali, *The Revival of Religious Sciences*, published towards the end of the eleventh century. In *Revival*, al-Ghazzali sought to reconstruct the Muslim civilization on what he saw as the true spiritual and moral basis of Islam. The monumental work, consisting of forty volumes, starts with a new and dynamic exposition of the epistemology of Islam and goes on to give extensive treatment to social behaviour and the Islamic way of life. During the life and times of al-Ghazzali, the Muslim civilization, despite its internal moral and ethical problems, was the dominant civilization. It was, therefore, natural for him to concentrate on spiritual and social matters. But Iqbal and Rafi-Ud-Din are writing for Muslims who have lost the very foundations of their societies: they operate in alien political structures, social organizations, cultural environment and a mode of production that bears no relationship to anything in Muslim history. Their task, then, is considerably more difficult than that of al-Ghazzali.

Ziauddin Sardar

Islamic Futures

Mansell Publishing Limited

London and New York